تعلیم

علامہ اقبال اور تعلیم کی تشکیلِ جدید

ڈاکٹر محمد یوسف گورایہ

جہاں تک میں نے غور کیا ہے تعلیم سے زیادہ اس قوم کی تربیت ضروری ہے اور ملی اعتبار سے یہ تربیت علماء کے ہاتھ میں ہے۔ اسلام ایک خالص تعلیمی تحریک ہے۔ صدر اسلام میں اسکول نہ تھے، کالج نہ تھے، یونیورسٹیاں نہ تھیں لیکن تعلیم و تربیت اس کی ہر چیز میں ہے۔ خطبۂ جمعہ، خطبۂ عید، حج، وعظ تعلیم و تربیت عوام کے بے شمار مواقع اسلام نے بہم پہنچائے ہیں۔ لیکن افسوس کہ علماء کی تعلیم کا کوئی صحیح نظام قائم نہ رہا۔ اور اگر کوئی رہا بھی تو اس کا طریق عمل ایسا رہا کہ دین کی حقیقی روح نکل گئی۔ جھگڑے پیدا ہو گئے اور علماء کے درمیان جنھیں پیغمبر علیہ السلام کی جانشینی کا فرض ادا کرنا تھا، سر پھٹول ہونے لگی۔ مصر، عرب، ایران، افغانستان ابھی تہذیب و تمدن میں ہم سے پیچھے ہیں، لیکن وہاں علماء ایک دوسرے کا سر نہیں پھوڑتے۔ وجہ یہ ہے کہ اسلامی ممالک نے اخلاق کے اس معیارِ اعلیٰ کو پالیا ہے جس کی تکمیل کے لیے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام مبعوث ہوئے تھے اور ہم ابھی اس معیار سے بہت دور ہیں ۔

کسی ملک کا نظامِ تعلیم اس کے طرزِ حکومت کا عکاس ہوتا ہے۔ ملوکیت، آمریت، جمہوریت، استعمار کی حکومتیں ملوکانہ، آمرانہ، جمہوری اور سامراجی مقاصد کے حصول کے لیے تعلیم کو بطور ذریعہ استعمال کرتی ہیں۔ علامہ اقبال نے پاکستان کی جدید اسلامی ریاست کے لیے جب نظامِ تعلیم پر غور کیا تو ان کے سامنے مغلیہ ملوکیت کے آلہ کار "درسِ نظامی" اور انگریزی استعمار کے محافظ "درسِ برطانوی" دو نظام موجود تھے۔ "درسِ برطانوی" کے واضح استعماری، مادی اور الحادی مقاصد، اسلامی ریاست کے مقاصد سے صریحاً متصادم تھے۔ "درسِ نظامی" ملوکیت کے مقاصد سے ہم آہنگ تھا۔ وہ جمہوریت کے لیے سازگار نہ تھا۔ درسِ برطانوی کے استعماری، مادی اور الحادی ہونے پر زیادہ اختلاف نہیں۔ البتہ ملوکیت اور درسِ نظامی کے متعلق کچھ اختلافِ رائے ضرور ہے۔ تعلیم کی تشکیلِ جدید پر علامہ اقبال کے افکار پیش کرنے سے پیشتر مُلّا و ملوک کے نظامِ تعلیم پر ان کا تبصرہ قرینِ مصلحت ہے۔ علامہ اقبال کے نزدیک اسلام میں ملوکیت حرام ہے۔ ایسی صورت میں اس کا آلہ کار نظامِ تعلیم، سلطانیِ جمہور کے خود بخود خلاف قرار پاتا ہے۔

ملوکیت حرام ہے

دورِ حاضر میں علامہ اقبال پہلے مجتہد ہیں، جنہوں نے ملوکیت کو حرام قرار دیا۔ ارمغانِ حجاز فارسی میں پانچ رباعیوں میں "خلافت و ملوکیت" دو متضاد طرزہائے حکومت کا موازنہ پیش کیا گیا ہے۔[1]

علامہ لکھتے ہیں، عربوں نے نورِ مصطفیٰؐ سے منور ہو کر عالمِ مشرق کے مردہ چراغ کو نورِ نبوت سے

منور کر دیا لیکن بعد میں نام نہاد اموی و عباسی گمراہ خلافت نے پھر گمراہی پھیلادی اور پہلی دفعہ مسلمانوں کو ملوکیت کی تعلیم دی:

عرب خود را بہ نور مصطفیٰؐ سوخت
چراغِ مردۂ مشرق برافروخت
ولیکن آں خلافت راہ گم کرد
کہ اوّل مومناں را شاہی آموخت![1]

خلافتِ اسلامیہ کا اصل منصب یہ ہے کہ وہ ناموسِ الٰہی کی محافظ ہو اور صرف توحید کے عقیدہ پر ایمان رکھتی ہو۔ اخوت، مساوات اور حریت پر عمل کرتی ہو جبکہ ملوکیت ہمہ کمر ہے، وہ عبادت اور عبادت گاہ کی نمائش، آرائش اور زیبائش سے اسلام کے ابدی و آفاقی اصولوں پر مبنی قانون کی حکمرانی، بنیادی انسانی حقوق اور شہری آزادیوں کو فنا کرتی ہے ؎

ملوکیت ہمہ کمر است و نیرنگ
خلافت حفظِ ناموسِ الٰہی است

"ملوکیت ہمہ کمر است" کی مثال یہ ہے کہ اخوت، مساوات، حریت اور جمہوریت کے منبع حجاز پر مسلط بادشاہ "خادم الحرمین الشریفین" کہلائے۔ ایک جدید جمہوری اسلامی ریاست میں متفق علیہ آئین کی جگہ فوجی آمریت قائم کرنے والا شخص "خادم اسلام" کا لقب پائے اور غاصب و ظالم ملوک و سلاطین "ظل اللہ علی الارض" کہلائیں۔

عقل عیار ہے سو بھیس بنا لیتی ہے
عشق بے چارہ نہ مُلّا ہے نہ زاہد نہ حکیم[2]

ملوکیت کے اس اسلام کو انسانیت سوز کردار کی وجہ سے علامہ اقبال، ملوکیت اور مردِ مومن کو ایک دوسرے کا حریف قرار دیتے ہیں۔ مومن، ملوکیت کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنے کے لیے خم ٹھونک کر اس کے مقابلے میں آتا ہے۔ وہ اسے اتنا بڑا منکر سمجھتا ہے کہ موسیٰ کلیم اللہ کی شان کے ساتھ اسے نیست و نابود کرنے کے لیے اس سے الجھ پڑتا ہے۔ وہ جہادِ حق میں فوج و خزانہ، مادی وسائل اور ضروریاتِ زندگی کی فراہمی کا بھی انتظار نہیں کرتا کیونکہ ملوکیت شرک ہے اور شرک ظلمِ عظیم ہے:

انّ الشرکَ لظلمٌ عظیم (قرآن ۳۱: ۱۳)

جسے مومن کسی حالت میں برداشت نہیں کر سکتا۔ علامہ کہتے ہیں ؎

در افتد با ملوکیت کلیمے
فقیرے، بے کلاہے، بے گلیمے[۴]

کلیم اللہ کی شان کے ساتھ ملوکیت سے الجھ پڑے، اپنی فقیری، بے سروسامانی اور ضروریات کی احتیاج کی پروا نہ کرے۔

علامہ اقبال دردِ دل کا اظہار کرتے ہیں کہ ہائے افسوس۔ ابھی تک انسان، انسان کا غلام ہے۔ ملوکیت بدترین قسم کی غلامی ہے۔ اس کا نظام خام اور کارکردگی ناقص و ناتمام ہے۔ یہ لاالٰہ کے منافی ہے، اس لیے کہا گیا ہے:

لاملوکیت فی الاسلام	اسلام میں ملوکیت حرام ہے

فرمانِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے:

اذا ھلک قیصر فلا قیصر بعدہٗ	(بخاری مناقب ۲۵)
اذا ھلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ	(بخاری ایمان ۳۱)

"جب قیصر ہلاک ہوجائے گا، اس کے بعد کوئی قیصر نہ ہوگا۔ جب کسریٰ ہلاک ہوجائے گا، اس کے بعد کوئی کسریٰ نہ ہوگا۔"

قیصر و کسریٰ کی ہلاکت دو اشخاص کی ہلاکت نہیں۔ یہ ملوکیت کے اس نظام کے خاتمے کا اعلان رسولؐ ہے جس کے وہ نمایندہ تھے۔ فرمانِ رسولؐ ہے:

اللّٰھم انت الملک لا الٰہ الا انت (مسلم مسافرین ۲۰۱)

"اے اللہ بادشاہ صرف تُو ہے، تیرے سوا کوئی معبود نہیں۔"

ایک اور ارشادِ نبویؐ ہے کہ

فاللہ ھو الملک "بادشاہ صرف اللہ ہے۔" (ترمذی ادب: ۷۶)
فلا ملکٌ الا اللہ "کوئی بادشاہ نہیں سوائے اللہ کے۔" (مسلم ادب: ۲۱)

ایک حدیث میں ہے:

لہ الملک ولہ الحمد (وھو علیٰ کل شیئٍ قدیر) (بخاری آذان: ۲۱)

"بادشاہت صرف اسی کے لیے ہے اور تعریف بھی اسی کے لیے ہے۔ وہ ہر چیز پر قادر ہے۔"

علامہ اقبال نے ملوکیت سے وابستہ کفر و شرک کے منکرات اور انسانیت کش کردار کی بنیاد پر

رحمتِ دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامنِ رحمت میں پناہ لی، جو اخوت و مساوات اور حریت کا دامن ہے۔ جس کے دین میں ملوکیت و ملّائیت ہمیشہ کے لیے حرام ہیں ؎

غلامِ فقرِ آں گیتی پناہم
کہ در دینش ملوکیت حرام است

"میں اس شاہِ دو عالم کے فقر کا غلام ہوں، جس کے دین میں ملوکیت حرام ہے"۔

اب یہاں ایک اہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں میں صدیوں تک ملوکیت قائم رہی، اس وقت بھی مقاماتِ مقدسہ اور بعض دوسرے ملکوں پر مسلط ہے اور فقہ ملوکیت میں اس کا جواز بھی پیدا کیا گیا ہے اس کے باوجود علامہ اقبال اس کے شدید مخالف ہیں اور اسے حرام قرار دیتے ہیں، کیوں؟ جواب یہ ہے کہ ملوکیت شرک ہے اور قرآن میں شرک ناقابلِ معافی گناہ ہے:

ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ و یغفر ما دون ذالک لمن یشاء و من یشرک باللہ فقد افتری اثما عظیما (قرآن: ۴ - ۴۸)

"خدا اس گناہ کو نہیں بخشے گا کہ کسی کو اس کا شریک بنایا جائے اور اس کے سوا اور گناہ کو جس کو چاہے معاف کر دے اور جس نے خدا کا شریک بنایا، اس نے بڑا بہتان باندھا"۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ ملوکیت شرک کیسے ہے؟

جواب یہ ہے کہ اللہ کے حکم کی جگہ غیر اللہ کا حکم چلانا شرک ہے۔ حدیث پاک ہے:

فاللہ ھو الملک — بادشاہ صرف اللہ ہے

قرآن کا ارشاد ہے:

ان الحکم الا للہ — حکم صرف اللہ کا ہے (۶: ۵۷)

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون (۵: ۴۴)

"اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں"۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الظالمون (۵: ۴۵)

"اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ ظالم ہیں"۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون (۵: ۴۷)

"اور جو اللہ کے نازل فرمائے ہوئے احکام کے مطابق حکم نہ دے تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں"۔

ملوکیت میں حکم بادشاہ کا ہوتا ہے۔ وہی "سپریم لارڈ آف دی لینڈ" ہوتا ہے۔ اس طرح حکم اللہ اور

حکم بادشاہ ایک دوسرے کے مدِ مقابل کھڑے ہوتے ہیں لہٰذا ملوکیت حرام ہے۔

عہدِ رسالت اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں نہ ملوکیت تھی اور نہ ملائیت تھی۔ خلافتِ راشدہ کے بعد جب ملوکیت قائم ہوئی تو اس نے اپنی تائید کے لیے ملائیت قائم کی۔ ائمہ مجتہدین مطلق، امام جعفر صادق امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل نے اس کی شدید مخالفت کی۔ ان پر تشدد ہوا۔ سزا ہوئی اور بعض نے قید میں شہادت پائی مگر انہوں نے ملوکیت کو جائز قرار نہیں دیا۔ بعد میں ملوکیت کے تنخواہ دار مجتہدین نے اسے سندِ جواز دے دی۔ جن کے جواز کا فتویٰ صدیوں تک رائج رہا، کیونکہ اس دوران کوئی مجتہدِ مطلق پیدا نہ ہوا۔ صدیوں کے بعد اب علامہ اقبال ایک مجتہدِ مطلق پیدا ہوئے ہیں، جنہوں نے ہر قسم کی آمریت، ملوکیت، ملائیت، رہبانیت اور خانقاہیت کو حرام قرار دیا ہے۔ مذہبی پاپائیت ملوکیت کی ضرورت ہے۔ یہ دونوں باہم انحصاری کے اصول پر قائم ہیں۔ جہاں ملوکیت نہ ہو، وہاں ملائیت فوجی آمریت پر گذارا کرتی ہے۔ کیونکہ یہ اصول اور مزاج میں ملوکیت ہی ہے۔ ان دونوں کی موجودگی میں انسانیت سہم جاتی ہے۔ عقل و فکر کی کلی مر جھا جاتی ہے۔ کروڑوں، اربوں انسانوں کے تفکر، تعقل، تفقہ، تدبر اور تبصر کے چشمے خشک ہو جاتے ہیں۔ علمی، فکری، تحقیقی اور تخلیقی اجاڑ اور ویرانی کا سماں پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن کے مطابق لوگ بظاہر زندہ ہوتے ہیں مگر باطن مردہ ہوتے ہیں۔ "اموات غیر احیاء" ان کے دل ہوتے ہیں لیکن ان سے سمجھتے نہیں۔ ان کی آنکھیں ہوتی ہیں مگر ان سے دیکھتے نہیں۔ ان کے کان ہوتے ہیں مگر ان سے سنتے نہیں۔ یہ لوگ بالکل چوپایوں کی طرح ہوتے ہیں، بلکہ ان سے بھی بھٹکے ہوئے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں:

لهم قلوب لا يفقهون بها ولهم اعين لا يبصرون بها ولهم اذان لا يسمعون بها اولئك هم الغافلون ۷ : ۱۷۹

"بینا اور نابینا برابر نہیں اور نہ اندھیرا اور روشنی اور نہ سایہ اور دھوپ اور نہ زندہ اور مردے برابر ہو سکتے ہیں۔"

وما يستوى الاعمى والبصير ولا الظلمت ولا النور ولا الظل ولا الحرور

وما يستوى الاحياء ولا الاموات ۳۵ : ۱۹ تا ۲۲

زندہ انسان، مردہ کیوں ہوتے ہیں؟

بینا انسان، نابینا کیوں ہوتے ہیں؟؟

وہ ایسا اس لیے ہوتے ہیں، کیونکہ بادشاہ اور آمر چند خوشامدی درباریوں اور پاپائیت چند

قوتِ بازوں کی آمریت قائم کر کے کروڑوں انسانوں کی عقلی، فکری، علمی، تحقیقی اور تخلیقی صلاحیتوں سے ملک و قوم کو محروم کر دیتے ہیں۔ زندہ انسانوں کا قبرستان بنا کر اس کے مجاور بن جاتے ہیں۔ اس حقیقت کو ثابت کرنے کے لیے زیادہ دلائل کی ضرورت نہیں کہ دنیا میں سب سے موثر اور فیصلہ کن طاقت انسانی عقل ہے۔ جس معاشرے میں عقلی اور فکری آزادی ہوتی ہے، وہاں کا دن اور ہوتا ہے، رات اور ہوتی ہے۔ وہاں قدرت اپنی شان کے نت نئے جلووں کے ساتھ جلوہ گر ہوتی ہے

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ
(۲۹ : ۵۵)

نشاں یہی ہے زمانے میں زندہ قوموں کا
کہ صبح و شام بدلتی ہیں ان کی تقدیریں

جبکہ ملوکیت، آمریت اور پاپائیت کے غلام معاشرے کی حالت یہ ہوتی ہے کہ :

ضمیرِ مغرب ہے تاجرانہ، ضمیرِ مشرق ہے راہبانہ
وہاں دگرگوں ہے لحظہ لحظہ، یہاں بدلتا نہیں زمانہ[۱]

مُلّا و ملوکیت کے اثرات

تاریخِ اسلام کی اوّلین باقاعدہ درس گاہ مسجدِ نبویؐ تھی۔ معلّم سرورِ دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم تھے نصابِ تعلیم قرآن تھا۔ طلبا صحابہ کرامؓ تھے۔ اس نے ایسے فاضلین پیدا کیے جو حکمرانوں کے رہبر، قانون کی حکمرانی، شہری آزادیوں اور بنیادی انسانی حقوق کے بانی تھے۔ تکریمِ انسانیت، اتحادِ انسانیت، اخوت، مساوات، حریت کے علمبردار تھے۔ عدل و انصاف، ایثار و احسان کے پیکر تھے۔ اخلاص و تقویٰ اور انس و غمخواری کے شاہکار تھے۔ فتح و نصرت اور اصولی جہاد و قتال کے شاہسوار تھے۔ اس مثالی درس گاہ کے نمونے پر قائم درس گاہیں، عہدِ ملوکیت میں گہنا گئیں۔ آئین و دستوری حکومت کی صفات، قانون کی حکمرانی، شہری آزادیوں اور بنیادی انسانی حقوق سے متعلق حصہ نصاب معطل کر دیا گیا۔ اس کی جگہ قدیم یونانی منطق و فلسفہ کی بحثیں، نظری مسائل اور فرقہ وارانہ فقہ کی تعلیم رائج کر دی گئی۔

مغلیہ ملوکیت اور درسِ نظامی

برِصغیر پاک و ہند میں مغلیہ ملوکیت قائم تھی۔ اس شاہی نظام کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے

لیے ایک تعلیمی نظام رائج تھا جو شہنشاہِ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں "درسِ نظامی" کے نام سے مشہور ہوا۔ مکتب، مسجد اور خانقاہ اس عہد کے اہم تعلیمی مرکز تھے۔ تینوں کا زوال مغلیہ ملوکیت کے زوال کا اہم سبب تھا۔ برطانوی عہد میں درسِ نظامی کا وہ حصہ جو ریاستی امور، حکومتی معاملات اور سیاسی، معاشی اور معاشرتی علوم سے متعلق تھا، معطل قرار پایا۔ علوم آلیہ، صرف و نحو، قدیم شعر و ادب، قدیم یونانی منطق و فلسفہ اور سامراج کی غلام مسلمان قوم کی مذہبی ضرورتوں کی حد تک فقہ اور ورثۂ حدیث باقی رہ گیا تھا۔ درسِ نظامی کے علومِ عالیہ بھی بتدریج ختم ہوتے چلے گئے تھے۔

علامہ اقبال نے جب پاکستان جیسی آزاد اور خود مختار جدید اسلامی ریاست کا خواب دیکھا تو اس کے ساتھ اس کے نظامِ تعلیم کی طرف بھی ان کی نگاہ گئی۔ اس وقت درسِ نظامی اپنے انحطاط کی نچلی سطح کو چھو رہا تھا۔ وہ ایک جدید ریاست کی تعلیمی ضرورتیں کیا پوری کرتا وہ تو ایک غلام قوم کی دینی اور معاشی ضرورتیں پوری کرنے کا اہل بھی نہیں رہا تھا۔

درسِ برطانوی اپنے استعماری مقاصد اور درسِ نظامی اپنے ملوکانہ مفادات کی وجہ سے پاکستان کی اسلامی جمہوری ریاست کے مقاصد سے متصادم تھے۔ اگر آج مغلیہ ملوکیت قائم ہوئی تو درسِ نظامی اس کے لیے مفید ہوتا اسی طرح اگر آج انگریزی استعمار موجود ہوتا تو درسِ برطانوی اس کے لیے کارآمد ہوتا۔ اسی لیے علامہ اقبال ان دونوں کو مضر قرار دے کر انہیں مسترد کرتے ہیں۔ کیونکہ ملوکیت اور استعمار دونوں ختم ہو چکے ہیں۔ اب ان کے محافظ نظام بھی ختم ہونے چاہییں۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ قرآن کی اساس پر تعلیم کی تشکیلِ جدید پر زور دیتے ہیں۔ یہ بڑا اجتہادی مسئلہ تھا۔ خداوندانِ مکتب اس کے اہل نہ تھے۔ کیونکہ وہ خود اس کی پیداوار اور اس کے محافظ تھے۔ اس عظیم و قدیم مسئلے پر وہی شخص اجتہاد کر سکتا تھا جو قرآنی علوم سے سرشار، اسوۂ حسنہ کا شیدائی اور امتِ مسلمہ کا فدائی ہو۔ چنانچہ اس کے لیے اللہ نے علامہ اقبال کو پیدا کیا۔ جس نے ملوکیت اور فقہ ملوکیت سے بالاتر اور آزاد ہو کر، قرآن و سنت کی اصل روح کو سمجھا اور مجتہدینِ مطلق کے عزم و ہمت کے ساتھ ملوکیت اور ملائیت کو صدیوں بعد حرام قرار دیا۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

علامہ اقبال نے مذہبی مکاتب و مدارس کے نظام و نصاب کی فرسودگی پر جو دلائل دیے ہیں، وہ ان کے اردو و فارسی شعری کلام اور انگریزی و اردو نثری تحریروں میں محفوظ ہیں۔ ان کے دلائل بالعموم دو قسم کی اصطلاحات پر ناقدانہ تبصرے کے انداز میں پائے جاتے ہیں:

۱۔ مکتب

۲۔ مدرسہ

مسجد اور خانقاہ کے اداروں پر تنقیدی شکل میں اور دوسرے ان سے وابستہ مُلّا، شیخ، مکتب قاروں لغت ہائے حجازی، خداوندانِ مکتب، فقیہانِ شہر، واعظِ قوم، خطیب، صوفی، شیخِ حرم پر ان کے تبصرے کی صورت میں۔ مغلیہ طوکیت کی مذہبی و تعلیمی ضروریات ان اداروں اور ان سے وابستہ ان عہدے داروں اور افراد سے پوری ہوتی تھیں۔ علامہ اقبال کے زمانے تک یہ ادارے اور عہدے دار اپنی کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے زوال کا شکار تھے۔ نہ ان میں رعنائی افکار تھی نہ لذتِ اسرار تھی۔ نہ افکارِ عمیق تھے اور نہ لذتِ کردار تھی۔ وہ غلامی، تقلید اور زوالِ تحقیق کا نمونہ تھے۔

آیئے! ان اداروں اور ان سے وابستہ عہدے داروں کے زوال اور ان کے مسلمانوں کے کردار پر منفی اثرات کا مطالعہ کریں اور علامہ اقبال کے تجزیے سے استفادہ کریں۔ علامہ اقبال اس حقیقت سے آگاہ ہیں کہ اس زوال و انحطاط کے باوجود خال خال اہلِ علم و عرفاں موجود ہیں جو زہد و تقویٰ کی مثال ہیں۔ علامہ کی تنقید و تبصرہ کے دوران یہ امر قاری کے ذہن میں موجود رہنا چاہیے وہ فرماتے ہیں:

خال خال اس قوم میں نظر آتے ہیں وہ
کرتے ہیں اشکِ سحر گاہی سے جو ظالم وضو

مکتب و مدرسہ

اسلامی نظام کی اصل اساس قرآن ہے۔

بدقسمتی سے مذہبی مدارس و مکاتب میں سب سے کم توجہ قرآن کے مطالب و مفاہیم پر دی جاتی ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان حکمتِ قرآن سے زندگی حاصل کرنے کی بجائے صوفی و مُلّا کی اسیری میں گرفتار ہو کر رہ جاتا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

بہ ہند صوفی و مُلّا اسیری
حیات از حکمتِ قرآں نگیری

صوفی و مُلّا نے مسلمان عوام پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کے لیے نجات دہندگی کا غیر اسلامی تصور عام کر رکھا ہے اور قرآن سے فقط یہ کام لیا جا رہا ہے کہ جب کوئی مرنے لگے تو اسے سورۂ یٰسین سنا دی جائے تاکہ اس کا دم آسانی سے نکل سکے:

بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست
کہ از یٰسین، او آساں بمیری [۹]

قرآن کے ساتھ یہ رویہ اس لیے اپنایا گیا ہے کیونکہ یہ درس گاہیں لذتِ کردار اور افکارِ عمیق سے خالی ہیں اور حکمتِ دیں کی تعلیم سے عاری ہیں۔ چونکہ مکتب و مُلّا خود حکمتِ قرآن سے ناآشنا ہیں اس لیے وہ دوسروں کو اس کی تعلیم دینے سے قاصر ہیں۔

ہند میں حکمتِ دیں کوئی کہاں سے سیکھے
نہ کہیں لذتِ کردار نہ افکارِ عمیق [۱۰]

تعلیم کا جوہر جرأتِ اندیشہ، تحقیق اور تخلیق ہے۔ جو ان دارالعلوموں میں مفقود ہے۔ یہ محکومی، تقلید اور زوالِ تخلیق کی آماجگاہ بن کر رہ گئے ہیں:

حلقۂ شوق میں وہ جرأتِ اندیشہ کہاں
آہ! محکومی و تقلید و زوالِ تحقیق [۱۱]

ترقی یافتہ اور ترقی پسند نظامِ تعلیم میں رعنائیِ افکار، تعمیرِ سیرت اور تشکیلِ کردار کو بنیادی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ مکاتب تخلیقِ افکار اور لذتِ اسرار دونوں سے تہی دامن ہیں۔ مکتبوں اور خانقاہوں میں فرسودہ افکار اس کثرت سے بھر لیے گئے ہیں کہ وہاں خوب و ناخوب کی تمیز ہی باقی نہیں رہی:

مکتبوں میں کہیں رعنائیِ افکار بھی ہے؟
خانقاہوں میں کہیں لذتِ اسرار بھی ہے؟
منزلِ راہروِاں دور بھی، دشوار بھی ہے؟
کوئی اس قافلہ میں قافلہ سالار بھی ہے؟ [۱۲]

پُر ہے افکار سے ان مدرسہ والوں کا ضمیر
خوب و ناخوب کی اس دور میں ہے کس کو تمیز
چاہیے خانۂ دل کی کوئی مسند خالی
شاید آ جائے کہیں سے کوئی مہمانِ عزیز [۱۳]

اس جمود و تقلید، بے نظری، بے فکری، رعنائیِ افکار و لذتِ اسرار سے بے اعتنائی کا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کی بلندی تک پہنچنے اور اپنے آپ کو اس کے مطابق ڈھالنے کی بجائے قرآن کو بدل دیتے

ہیں۔ ان فقیہانِ شہر کی پستیِ فکر و کردار کی انتہا ہے:

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق!
ان غلاموں کا یہ مسلک ہے کہ ناقص ہے کتاب
کہ سکھاتی نہیں مومن کو غلامی کے طریق![۱۴]

تعلیم و تحقیق کے اس زوال پر علامہ اقبال، خداوندانِ مکتب سے شکایت کرتے ہیں کہ وہ شاہین بچوں کو خاکبازی کا سبق دے رہے ہیں:

شکایت ہے مجھے یارب! خداوندانِ مکتب سے
سبق شاہین بچوں کو دے رہے ہیں خاکبازی کا

قرآنی نظامِ تعلیم کا بنیادی مقصد اہلِ توحید کا اتحاد، اخوت اور مساوات ہے۔ اس کے برخلاف مکتب و مُلّا افتراق و انشقاق کی آماجگاہ ہیں۔ جسے کوئی قوم برداشت نہیں کر سکتی؛

مُلّا و مکتب کی تنگ نظری، فرقہ وارانہ روش، بحث و تکرار پر علامہ اس طرح تبصرہ کرتے ہیں:

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت
ہے بد آموزیِ اقوام و ملل کام اس کا
اور جنت میں نہ مسجد نہ کلیسا نہ کنشت[۱۵]

شیخ و مُلّا

علامہ اقبال حکیم الامت اس لیے ہیں کہ وہ شیخ و مُلّا اور مریدوں کی فطرت کے درمیان فرق و امتیاز کو خوب جانتے تھے۔ انہیں معلوم ہے کہ اگرچہ مسلمان شیخ و مُلّا کے حلقۂ ارادت میں گرفتار ہے مگر فطرتاً وہ ان سے مختلف ہے اور تلاشِ حق میں سرگرداں ہے۔ مسلمان کی فطرت میں توحید و تحقیق ہے۔

جب کبھی شیخ و مُلّا کی اسیری کے دوران اسے حق بات پہنچ جاتی ہے تو وہ پھڑک اٹھتا ہے مگر ایسی بات شیخ و مُلّا کو بُری لگتی ہے کیونکہ اس سے اس کے مذہبی کاروبار پر زد پڑتی ہے۔

ہے مریدوں کو تو حق بات گوارا لیکن
شیخ و مُلّا کو بری لگتی ہے درویش کی بات[۱۶]

اس نظامِ تعلیم میں متاعِ کردار جاتی رہی، کیونکہ اس کے اسباق حقیقت اور صداقت کی تعلیم کی بجائے فلسفۂ ذات و صفاتِ الٰہی کی بحث پر سارا زور صرف کرتے ہیں۔ خداوندانِ مکتب کو معاشی، معاشرتی سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی عملی مسائل سے کوئی تعلق نہیں۔ قدیم یونانی تصورات کے تحت الٰہیات میں الجھے ہوئے ہیں:

قوم کے ہاتھ سے جاتا ہے متاعِ کردار
بحث میں آتا ہے جب فلسفۂ ذات و صفات[۱۷]

لذتِ بحث و تکرار اور علمِ خودی مختلف اور متضاد موضوع ہیں۔ شیخِ مکتب بحث و تکرار سے تو محظوظ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ علمی زندگی سے دور لے جاتا ہے مگر علمِ خودی کے نام سے بدکتا ہے۔ کیونکہ اس سے خود آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

اقبال! نام نہ لے علمِ خودی کا
موزوں نہیں مکتب کے لیے ایسے مقالات
بہتر ہے کہ بے چارے مولوں کی نظر سے
پوشیدہ رہیں باز کے احوال و مقامات[۱۸]

افکارِ تازہ قوموں کی حیاتِ اجتماعیہ میں تازہ خون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ایسے افکار کی تعلیم کی توقع ان مدارس سے کیسے ممکن ہے؟ کیونکہ مکتب و ملّا محرومِ شوق ہے۔ وہ پست فکر اور کور ذوق ہے۔ تحقیق اور اجتہاد کے لیے وسعتِ علمی، وسعتِ قلبی اور وسعتِ فکری ضروری ہے جو ان کے ہاں تین سو سال سے مفقود ہے:

از سہ قرن ایں امت خوار و زبوں
زندہ بے سوز و سرودِ اندروں
پست فکر و دوں نہاد و کور ذوق
مکتب و مُلّائے او محرومِ شوق[۱۹]

اسلام وحدتِ ادیان اور اتحادِ انسانیت کا داعی ہے مگر مکتب و مُلّا وحدتِ امت کا دشمن اور افتراق کا علمبردار ہے۔ ایک تو غیر کی تدبیر سے قوم کشتہ بنی ہوئی ہے۔ دوسرے یہ نظامِ تعلیم تخریبِ خود اور تعمیرِ غیر کے کام میں معروف ہے:

از دمِ او وحدتِ قومے دو نیم
کس حریفش نیست جز چوبِ کلیم
وائے قومے کشتۂ تدبیرِ غیر
کارِ او تخریبِ خود، تعمیرِ غیر[۲۰]

قوموں کے عروج و زوال میں نظامِ تعلیم کو محوری حیثیت حاصل ہوتی ہے۔ اساتذہ ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں مگر شیخِ مکتب اپنے اس مقام کو نہیں جانتا۔ اس کم سواد و کم نظر کو خبر نہیں کہ مسلمان کے عروج و زوال میں اس کا کیا کردار ہے؟

شیخِ مکتب کم سواد و کم نظر
از مقامِ او ندارد او خبر[۲۱]

مُلّا و مکتب اپنی کم نگاہی اور کور ذوقی کے سبب اتحادِ امت کو پارہ پارہ کیے ہوئے ہیں۔ اسے فکر نہیں کہ اس کی قال و اقول اور بحث و تکرار کے منفی اثرات قوم کے نوجوانوں اور نونہالوں کے تازہ ذہنوں پر مرتب ہو رہے ہیں۔ وہ قومی و ملی نفع و نقصان سے بے نیاز ہو کر قوم کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے پر تلے بیٹھے ہیں:

کم نگاہ و کور ذوق و ہرزہ گرد
ملت از قال و اقولش فرد فرد[۲۲]

یہ افسوس کا مقام ہے کہ غیر تو اپنی تدبیر سے مسلمان قوم کو نقصان پہنچا رہا ہے مگر اس سے بڑا افسوس یہ ہے کہ مکتب و مُلّا تخریبِ خود اور تعمیرِ غیر میں اپنی توانائیاں صرف کر رہا ہے۔ اس کی تخریبِ خود کا ثبوت یہ ہے کہ کفر اسے مٹا دینے کے لیے ہمہ وقت فکر و تدبیرِ جہاد میں معروف ہے جبکہ اس کی حالت یہ ہے کہ اس نے فی سبیل اللہ فساد کو اپنا دین قرار دے رکھا:

دینِ کافر فکر و تدبیرِ جہاد
دینِ مُلّا فی سبیل اللہ فساد[۲۳]

مکتب و مُلّا تخریبِ خود اور تعمیرِ غیر میں اتنا دور نکل گیا ہے کہ اس سے تعمیر اور کشادہ دلی کی توقع

امرِ محال نظر آتی ہے:

شیخِ مکتب کے طریقوں سے کشادِ دل کہاں
کس طرح کبریت سے روشن ہو بجلی کا چراغ[۱۳]

اس تخریب مزاجی اور تنگ دلی سے نہ وہ خود کتاب اللہ کو سمجھ سکا ہے اور نہ اپنے اندر سمجھانے کی صلاحیت پیدا کر سکا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ کتاب خواں کہلا سکتا ہے مگر وہ صاحبِ کتاب نہیں کہلا سکتا۔

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحبِ کتاب نہیں[۱۴]

قرآن وہ ہے جس نے مومن کو تسخیرِ کائنات پر مامور کیا۔ انفس و آفاق کی تسخیر اس کا دینی فریضہ ہے مگر اب اسی قرآن سے ترکِ دنیا کی تعلیم دی جا رہی ہے:

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم
جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر
تن بہ تقدیر، ہے آج ان کے عمل کا انداز
تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب، بتدریج وہی خوب ہوا
غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر[۱۵]

علم روشنی ہے۔ جہالت اندھیرا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کم سواد و کم نظر، لذتِ کردار اور افکارِ عمیق سے محروم خداوندانِ مکتب، اسرارِ کتاب الٰہی سے بے خبر ہیں۔ کتاب اللہ نورِ آفتاب ہے۔ مادر زاد اندھے آفتاب کی تابانی میں بھی روشنی سے محروم رہتے ہیں۔ علامہ نے کتاب اللہ کے اسرار کو نورِ آفتاب کہا ہے اور مکتب و مُلّا کے کسبِ فیض سے محرومی کو مادر زاد اندھے سے تشبیہ دی ہے:

مکتب و مُلّا و اسرارِ کتاب
کورِ مادر زاد و نورِ آفتاب[۱۶]

علامہ صاحبِ قرآن اور بے ذوقِ طلب کے تضاد پر تعجب کا اظہار کرتے ہیں:

صاحبِ قرآں و بے ذوقِ طلب
العجب ثم العجب ثم العجب[۲۰]

ان درس گاہوں سے مایوس ہو کر علامہ اقبال مسلمان کو تلقین کرتے ہیں:

اے مسلمان! اپنے دل سے پوچھ، مُلّا سے نہ پوچھ
ہو گیا اللہ کے بندوں سے کیوں خالی حرم[19]

"تاویلِ قرآن کی ایجاد سے قرآن کے صاف، سادہ اور واضح احکام، پیچیدہ، مشکل اور ناقابلِ عمل بنا دیے گئے۔ قرآن عمل پہ آمادہ کرتا ہے۔ اس کی تاویل سے قرآنی روح کو دفن کر دیا جاتا ہے۔ قرآن کو تاویل کے ذریعے پازند کی طرح ناقابلِ عمل بنا دیا گیا ہے۔ قرآن جو سراسر عمل تھا اس کے مقابلے میں تاویل کے ذریعے ایک نئی شریعت، فقہ ملوکیت ایجاد کر لی گئی ہے، جو ناقابلِ عمل ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خداوندانِ مکتب اور قارون لغت ہائے حجازی کتاب اللہ کی تاویلات میں لذت و سرور حاصل کرتے ہیں اور اپنے اس رویے سے خود کو اور قوم کو عمل سے بہت دور لے گئے ہیں۔

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسّر
تاویل سے قرآں کو بنا دیتے ہیں پازند
قرآن کو بازیچۂ اطفال بنا کر
چاہے تو خود اک تازہ شریعت کرے ایجاد[20]

ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے
یہ کتاب اللہ کی تاویلات میں اُلجھا رہے[21]

مکتب و مُلّا اور خانقاہ و صوفی پہ بھرپور تبصرہ علامہ اقبال کے ان اشعار میں ہے جن سے ان کے منہجِ فکر اور عملی زندگی سے دُوری کا پتہ چلتا ہے:

توڑ ڈالیں جس کی تکبیریں طلسمِ شش جہات
ہو نہ روشن اس خدا اندیش کی تاریک رات
ابنِ مریم مر گیا یا زندۂ جاوید ہے؟
ہیں صفاتِ ذاتِ حق، حق سے جدا یا عینِ ذات؟
آنے والے سے مسیحِ ناصری مقصود ہے
یا مجدد جس میں ہوں فرزندِ مریم کے صفات
ہیں کلام اللہ کے الفاظ حادث یا قدیم؟
امتِ مرحوم کی ہے کس عقیدے میں نجات؟

کیا مسلماں کے لیے کافی نہیں اس دور میں
یہ الٰہیات کے ترشے ہوئے لات و منات؟
تم اسے بیگانہ رکھو عالمِ کردار سے
تا بساطِ زندگی میں اس کے سب مہرے ہوں مات!
خیر اسی میں ہے قیامت تک رہے مومن غلام
چھوڑ کر اوروں کی خاطر یہ جہانِ بے ثبات
ہے وہی شعر و تصوف اس کے حق میں خوب تر
جو چھپا دے اس کی آنکھوں سے تماشائے حیات!
ہر نفس ڈرتا ہوں اس امت کی بیداری سے میں
ہے حقیقت جس کے دیں کی احتسابِ کائنات!
مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اسے[۱۲]

علامہ اقبال سمجھتے ہیں کہ اس سے نجات کی ایک ہی راہ ہے اور وہ یہ کہ قرآن سے براہِ راست ہدایت اخذ کی جائے مگر وہ جانتے ہیں کہ قرآن کی ہر آیت پر عرب اپیریلزم اور مجوسی عقاید کی تفسیر اور تشریح کا غلاف چڑھا ہوا ہے۔ ہر آیت کا معنی سلطانی و ملائی و پیری کے نقطۂ نظر سے متعین کر دیا گیا ہے اور ان کے پجاری رات دن یہ راگ الاپتے رہتے ہیں کہ جس طرح قرآن دائمی ہے اسی طرح اس کی تفسیر دائمی ہے۔ ان عجمی خلافوں کو پھاڑ کر روحِ قرآن تک پہنچنا آسان نہیں۔ اسی صورتِ حال کے پیشِ نظر علامہ اقبال فرماتے ہیں:

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزولِ کتاب
گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشاف[۱۳]

مسجد

اسلام آفاقی اور عالمگیر دین ہے۔ اس میں روئے زمین کا ہر چپہ مسجد ہے۔ باقاعدہ مسجد کا اسلام میں بہت بڑا مقام ہے:

دنیا کے بتکدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

دنیا کی تمام مسجدیں بنات الکعبہ کہلاتی ہیں۔ مسجد مسلمانوں کی تعلیم، تنظیم اور توحید کا مرکز ہے۔ سلطانی و ملائی و پیری کے اقتدار میں مسجد کا نظام زوال کا شکار ہوا اور مسلسل زوال پذیر ہے۔ جن نمازیوں سے سطوتِ توحید قائم ہوئی تھی، وہ برہمن کی نذر ہو گئیں:

سطوتِ توحید قائم جن نمازوں سے ہوئی
وہ نمازیں ہند میں نذرِ برہمن ہو گئیں[۲۴]

مکتب و ملا کے نظامِ تعلیم و تربیت سے منبر و محراب اس سجدے کو ترس گئے ہیں جس سے روحِ زمیں کانپ جاتی تھی:

وہ سجدہ روحِ زمیں جس سے کانپ جاتی تھی
اسی کو آج ترستے ہیں منبر و محراب[۲۵]

بے شک جمعہ و عیدین پر اب بھی مسلمانوں کی شان و شوکت کا اظہار ہوتا ہے مگر اللہ کے نزدیک صرف مردِ حُر کی تکبیر ہی قبول ہوتی ہے:

سجدۂ عید کا منکر نہیں ہوں میں لیکن
قبولِ حق ہیں فقط مردِ حُر کی تکبیریں[۲۶]

مسجد تقویٰ و اخلاص کا مخزن تھی۔ اب محض نفاق و ریاکاری کا مرکز بن کے رہ گئی ہے۔ کیونکہ مسجد کی عظمت کا انحصار واعظ و خطیب کی پختہ خیالی، برقِ طبعی اور شعلہ مقالی پر تھا، جو اب مفقود ہے۔ اب صرف رسمِ اذاں باقی ہے، روحِ بلالی موجود نہیں:

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی
برقِ طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا، تلقینِ غزالی نہ رہی

مسجدوں میں اگرچہ اب بھی نمازی ہیں مگر مسلمانوں کی آبادی کے اعتبار سے مسجدیں مرثیہ خواں ہیں اور جو نمازی رہ گئے ہیں وہ بھی حجازی اوصاف نمازیوں کی صفات سے خالی ہیں:

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے
یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے

قرآن کے مطابق ریاکار نمازی جہنم رسید ہوگا:

فویل للمصلّین الّذین ھم عن صلاتھم ساھون۔ الّذین ھم یراءون۔

(۱۰۷ : ۴ - ۶)

آج حالت یہ ہے کہ عبادت تصنع و نمائش بن گئی ہے۔ مسجد کے مناروں پہ لاؤڈ سپیکر نصب کر کے رونے کا ڈرامہ کیا جاتا ہے :

تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں، پر کیا لذت اس رونے میں
جب خونِ جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا

ترا امام بے حضور، تیری نماز بے سرور
ایسی نماز سے گزر، ایسے امام سے گزر[۳]

وہ ایک سجدہ جسے تُو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدے سے دیتا ہے آدمی کو نجات

سچے واعظین اسلام کی دعوت، حکمت، موعظہ حسنہ اور جدل بالاحسن پر مبنی ہوتی تھی :

ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالّتی ھی احسن۔

"اپنے رب کی طرف سے دعوت دو اور موعظہ حسنہ کے ساتھ اور ان سے بحث کرو احسن طریقے سے۔"

اب واعظ کی اغلاط پذیر صورت یہ ہے کہ مصنوعی رقّت طاری کی جاتی ہے اور آوازِ اذان سن کر مصنوعی لرزے کی کیفیت پیدا کر لی جاتی ہے :

عجب واعظ کی دینداری ہے یارب!
عداوت ہے اسے سارے جہاں سے
بڑی باریک ہیں واعظ کی چالیں
لرز جاتا ہے آوازِ اذاں سے[۴]

علامہ اقبال عبادت اور عبادت گاہ کی نمائش کے خلاف ہیں، وہ عبادت کی روح کے حصول پہ زور دیتے ہیں، جو فی زمانہ مفقود ہے :

ہے طوافِ و حج کا ہنگامہ اگر باقی تو کیا
کند ہو کر رہ گئی مومن کی تیغِ بے نیام[۱۹]

پہلے مسجد کی تعلیم دلنشیں، دلآویز اور دلپذیر ہوتی تھی مگر اب عربی لغت کے بکھیڑوں، تصوف و معرفت کی اصطلاحات سے "قاروں لغت ہائے حجازی" نے اسے بہت مشکل، پیچیدہ اور ناقابلِ فہم بنادیا ہے۔

قلندر جز دو حرفِ لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہِ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

وہ مذہبِ مرداں خود آگاہ و خدا مست
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات![۶۸]

مسجد کی تبلیغ و دعوت لذتِ شوق سے پُر اور سادہ کلامی کا مرقع ہوتی تھی مگر اب خطیبِ ملت کا خطاب دل کو لبھاتا تو ہے مگر لذتِ شوق سے بے نصیب ہے۔ جس کے خرمن میں سرمایہ دار، جاگیردار، سگِ گر سجادہ نشین، فوجی و سول نوکرشاہی سب آسودہ ہیں:

لبھاتا ہے دل کو کلامِ خطیب
مگر لذتِ شوق سے بے نصیب
بیاں اس کا منطق سے سلجھا ہوا
لغت کے بکھیڑوں سے الجھا ہوا[۶۹]

پہلے زمانے میں خطیب، دینی و ملکی ترجیحات کا ماہر اور قومی و ملی نفسیات کا نباض ہوتا تھا مگر اب وہ دینی و قومی ترجیحات سے کلیتہً بے خبر ہے۔ وہ قیام، رکوع اور سجدے کی حالتوں کی حقیقت سے ناواقف ہے۔

یہ مصرع لکھ دیا کس شوخ نے محرابِ مسجد پہ
کہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا[۷۰]

واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعاً ولا تفرقوا

"اور سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو اور تفرقہ نہ کرو۔"

مسجد کا ماٹو تھا مگر بے بصر، کم سواد، کم نظر خطیب نے عین مسجد کو فرقہ آرائی کے اکھاڑے میں تبدیل کر دیا ہے:

شجر ہے فرقہ آرائی، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو[۷۱]

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ ان کی گرفتاری بھی دیکھ
دیکھ مسجد میں شکست رشتۂ تسبیح شیخ؛
بتکدے میں برہمن کی پختہ زناری بھی دیکھ[۱۳۶]

مسجد اپنے دورِ عروج میں آزادیٔ فکر کی سب سے بڑی علمبردار تھی۔ فکر رکھنا اور اس کا اظہار کرنا اس کا طرۂ امتیاز تھا۔ سیدنا عمرؓ نے اپنے بہت سے فیصلے منبرِ رسولؐ پر بیٹھ کر بدلے۔ جب کسی عام بندہ حریتِ فکر کے متوالے یا آزادیٔ فکر کی پیکر، کسی خاتون نے حضرت عمرؓ کو ٹوکا اور مختلف حکومتی معاملات پر وضاحت طلب کی، جس پر سیدنا عمرؓ نے برملا کہا! اگر یہ خاتون نہ ہوتی تو عمرؓ ہلاک ہو جاتا۔

اب فقیہ و خطیب کی تنگ نظری، جمود اور جہالت کا یہ عالم ہے کہ مسجد و مکتب آزادیٔ رائے کے سب سے بڑے دشمن اور اجتہاد و استنباط کے سب سے بڑے مخالف ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ وہاں فرسودہ خیالات کی غوغا آرائی تو بہت ہے مگر تازہ افکار و اجتہاد نہ ہونے کے سبب قبرستان کا سا سناٹا ہے۔

کس کو معلوم ہے ہنگامۂ فردا کا مقام
مسجد و مکتب و مے خانہ ہیں مدت سے خموش

اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آزادی و حریتِ فکر کے اس قحط و قبرستان میں جب کوئی اللہ کا بندہ حق بات کہتا ہے، اسلام کی تعبیرِ نو حالاتِ حاضرہ کے مطابق کرتا ہے، صید مُلّایان، نخچیرِ ملوک، کشتۂ سلطانی و مُلّائی و پیری کو نجات دینے کے لیے دلِ دردمند کے ساتھ اٹھتا ہے تو شیخِ حرم، خطیبِ مسجد اور فقیہانِ شہر اس کے خلاف متفقہ مورچہ بنا لیتے ہیں، گویا وہ ہر منفی چیز پر متفق ہیں مگر تعمیر کے خلاف ہیں۔ وہ تخریب خود اور تعمیر غیر کے امام ہیں۔

مکتب و مُلّا اور مسجد و خانقاہ کی حالتِ زار اور زوال پر ہم نے علامہ کے دلائل پیش کیے۔ ان کے مطالعہ و تجزیہ کے مطابق یہ ادارے اور ان سے وابستہ عہدے دار اپنے دورِ عروج میں جو خدمات انجام دے چکے تھے، دورِ زوال میں وہ خدمات انجام دینے کے اہل نہیں رہے۔ اب فرسودہ ہو کر بانجھ پن میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ فرسودہ افکار کے بارے میں علامہ اقبال یہ رائے پیش کرتے ہیں؛

"The virdict of history is that worn out ideas have never risen to power omong a people who have worn them out.

The Reconstruction P.151

"تاریخ کا فیصلہ ہے کہ جن فرسودہ تصورات کو خود کسی قوم نے فرسودہ قرار دے دیا ہو، اس قوم میں کبھی قوت حاصل نہیں کر سکتے۔"

مغلیہ ملوکیت کا نظام و نصابِ تعلیم اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ اس کے زوال و انحطاط کے سبب خود مغلیہ ملوکیت نیست و نابود ہو چکی ہے۔ اب وہ مسلمان قوم کو دوبارہ کیسے قوت دے سکتا ہے۔ یہ امر محال ہے دین و تاریخ کے مسلّمہ اصولوں کے خلاف ہے۔

بتانِ عجم

سلطانی و مُلّائی و پیری کے نظامِ تعلیم و تربیت سے جو تہذیب و ثقافت معرضِ وجود میں آئی، اس کے چار نمایاں پہلو تھے:

۱۔ تمدن

۲۔ تصوف

۳۔ شریعت

۴۔ کلام

علامہ اقبال کہتے ہیں:

تمدن، تصوف، شریعت، کلام
بتانِ عجم کے پجاری تمام[۴۶]

اس شعر میں ایک بلیغ اسلوبِ بیان کے ذریعے ایک ہزار سال کی تاریخ بیان کر دی گئی ہے۔ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں تمدن، تصوف، شریعت، کلام؛ چار نمایاں پہلو ہیں۔ یہ چاروں عرب امپیریلزم، عجمی ملوکیت، مجوسی عقاید اور عجمی تصوّرات سے اس درجہ متاثر ہوئے کہ وہ بتانِ عجم کی شکل اختیار کر گئے اور مسلمان ان بتوں کے پجاری بن کر رہ گئے۔

تمدّن

مسلمانوں کا تمدّن ہندو تہذیب و ثقافت کے رسوم و رواج پر قائم ہے۔ خوشی و غمی کی تمام تقریبات پر ہندو معاشرت کے گہرے اثرات موجود ہیں۔ مسلمانوں کی تمدّنی زندگی پر انگریزی تہذیب و ثقافت غالب ہے۔ اس طرح بحیثیت مجموعی مسلمانوں کا تمدن ہنود، یہود اور نصاریٰ کے اجزائے نمائندہ کا مرکب ہے۔ علامہ

کہتے ہیں:

وضع میں تم ہو نصاریٰ تو تمدن میں ہنود
یہ مسلماں ہیں! جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود[۵۷]

مسلمانوں کے تمدن پہ برہمنیت کے اثرات اس حد تک گہرے ہیں کہ برہمن نے بتوں کو طاق پہ سجایا تو اس کی پیروی میں مسلمان نے بت کی جگہ قرآن کو طاق پہ سجا رکھا۔ اسے علامہ اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے:

برہمن از بتاں طاقِ خود آراست
تو قرآں را سرِ طاقِ نہادی[۵۸]

تصوف

علامہ اقبال نے بتانِ عجم میں دوسرا بت تصوف کو قرار دیا ہے، کیونکہ حلقۂ صوفی، سوزِ مشتاقی سے خالی ہو گیا ہے، البتہ اس میں فسانہ ہائے کرامات رہ گئے ہیں:

رہا نہ حلقۂ صوفی میں سوزِ مشتاقی
فسانہ ہائے کرامات رہ گئے باقی[۵۹]

اصل صوفیاء تو غائب ہو گئے ہیں، جو اپنی روشن ضمیری کے لیے مشہور تھے، اب صرف ان کی جعلی نقل باقی ہے:

نہ مومن ہے نہ مومن کی امیری
رہا صوفی، گئی روشن ضمیری

کرے گی داورِ محشر کو شرمسار اک روز
کتابِ صوفی و مُلّا کی سادہ اوراقی[۶۰]

علامہ اقبال نے اسلام کی متحرک اور توانا تعلیمات کی بنیاد پہ ایک فعال، موثر، مستحکم اور مضبوط اسلامی ریاست کے قیام کا خواب دیکھا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ خانقاہیت اور رہبانیت کو اس جدید ریاست کے لیے موزوں قرار نہیں دیتے۔ خانقاہی نظام اب شیری و شہنشاہی کی جگہ فقط رو باہی میں تبدیل ہو کر رہ گیا ہے۔ اب اس کا کام فقط پیروں کی کرامتیں بیان کرنا ہے۔ حالانکہ اگر مسلمان خانقاہی نظام کی غلامی سے آزاد ہو جائے

تو وہ خود ایک زندہ کرامت بن سکتا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

یہ معاملے ہیں نازک جو تری رضا ہو تو کر
کہ مجھے تو خوش نہ آیا یہ طریقِ خانقاہی[اقلہ]

جہاں تھا مدرسہ شبیری و شہنشاہی
آج ان خانقاہوں میں ہے فقط روباہی[۲ھلہ]

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد
محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا
یہ سالک مقامات میں کھو گیا

کیے ہیں فاش رموزِ قلندری میں نے
کہ فکرِ مدرسہ و خانقاہ ہو آزاد[۲ھلہ]

شریعت

علامہ اقبال نے بتانِ عجم میں شریعت کو بھی شمار کیا ہے۔ اس سے مراد کتاب و سنت والی شریعت نہیں۔ شریعتِ الٰہیہ تو خود بت شکن ہے۔ اس سے مراد فقہِ ملوکیت ہے۔ وہ عرب ایمپیریلزم کے زیرِ اثر پروان چڑھی اور امتِ مسلمہ کے ضمیرِ مطلق اور انسانیت کے مفادِ عامہ کے خلاف تھی۔ وہ ملوکیت کے مقاصد کو بروئے کار لانے کے لیے مرتب ہوئی تھی۔ علامہ اقبال کے مطابق اس فقہ پر عرب ملوکیت کی گہری چھاپ تھی۔ اس پر علامہ اقبال کے اپنے الفاظ یہ ہیں:

"I therefore demand the formation of a conslidated Muslim State in the best interest of India and Islam. For India, it means security and peace resulting from and internal balance of power, for Islam, an opportunity to rid itself of the stamp that Arabian Inmperialism was forced to give it, to mobilise its laws its education and culture and to bring them into closer contact with teh spirit of modern times." (Syed Sharif ud Din Pirzadah, Foundation of Pakistan, Vol-II, Page, 160)

"میں اس لیے ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفاد میں ایک متحدہ مسلم ریاست کی تشکیل کا مطالبہ کرتا ہوں۔ اس سے ہندوستان کو اندرونی طاقت کے توازن کے نتیجے میں تحفظ اور امن حاصل ہوگا۔ اس سے اسلام کو موقع ملے گا کہ وہ اپنے اوپر عرب امپیریلزم کی بالجبر لگی ہوئی چھاپ سے نجات حاصل کرے۔ اسلامی احکام، اسلامی تعلیم و ثقافت کو متحرک کرے اور انہیں جدید روحِ عصر کے قریبی رابطے میں لائے۔"

علامہ اقبال اپنے انگریزی خطبات میں لکھتے ہیں:

"اب کوئی چارۂ کار ہے تو یہ کہ ہم اس چھلکے کو اتار پھینکیں جو سختی کے ساتھ اسلام پہ جم گیا ہے۔ جس نے مکمل طور پہ متحرک نظریۂ حیات کو بالکل جامد بنا کر رکھ دیا ہے۔ حریت، مساوات اور وحدت کی اصل صداقتوں کو پھر سے منکشف کریں تا کہ اپنے اخلاقی، معاشرتی اور سیاسی اعلیٰ مقاصد کی از سرِ نو تعبیر ان کے اصلی، سادہ اور عالمگیر نقطۂ نظر سے کر سکیں۔" [۵۵]

فقہ کی تشکیلِ نو، جدید اسلامی ریاست کا بنیادی مسئلہ ہے۔ دوسری طرف فقیہِ شہر، فقہِ ملوکیت کے دوام کا قائل ہے۔ وہ اس کی تشکیلِ جدید کی ہر کوشش کو مذہبی قوت و قہر سے مٹا دینے پہ تُلا ہوا ہے اس پر علامہ لکھتے ہیں:

"عہدِ حاضر کے حنفی فقہاء نے اپنے مذہب کی روح کے خلاف امام ابو حنیفہؒ یا ان کے شاگردوں کی تعبیرات کو دوامی حیثیت دے رکھی ہے۔ جس طرح شروع شروع میں امام ابو حنیفہؒ کے ناقدین نے ان فیصلوں کو دائمی حیثیت دے لی تھی، جو مخصوص معاملات پر دیئے گئے تھے۔" [۵۶]

علامہ اقبال فقیہِ شہر کی مذہبی قوت و طاقت سے آگاہ تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس کی فتویٰ بازی کتنی مؤثر

ہے۔ وہ علم و تحقیق سے جواب دینے کی بجائے اشتعال انگیزی اور فتنہ گری میں ماہر ہے۔ وہ ماہرِ نفسیات ہے۔ وہ جانتا ہے کہ "صیدِ ملایاں" اور "نخچیرِ ملوک" عوام میں، اس کا فتویٰ کتنا اشتعال پیدا کر سکتا ہے اس لیے علامہ ایک طرف فقہ کی تشکیلِ جدید کو وقت کی اہم ترین ضرورت سمجھتے تھے، تو دوسری طرف فقہِ ملوکیت کے محافظ فقیہِ شہر کی قوت کا اظہار بھی کرتے تھے۔ لکھتے ہیں:

فقیہِ شہر کی تحقیر! کیا مجال مری
مگر یہ بات کہ میں ڈھونڈتا ہوں دل کی کشاد

قدیم فقہِ ملوکیت کو بتانِ عجم میں شمار کر کے علامہ اقبال نے کسی ایک فقیہ کے غیظ و غضب کو دعوت نہیں دی، بلکہ اس سے پورے طبقۂ فقیہانِ شہر کی معاشی و معاشرتی عزت و وقار کو چیلنج کیا ہے۔ جو شخص اس طبقے کو بتانِ عجم کا پجاری کہے گا وہ اس پورے طبقے کو غیظ و غضب کی دعوت دے گا اور وہ متحدہ قوت سے اس کا مقابلہ کریں گے۔ اپنے ان احساسات کو علامہ اقبال نے اس طرح بیان کیا ہے:

یہ اتفاق مبارک ہو مومنوں کے لیے
کہ یک زباں ہیں فقیہانِ شہر میرے خلاف

علامہ اقبال کے ان دلائل سے ثابت ہوا کہ فقہ کو حرفِ آخر قرار دے کر ۔۔۔ ں کو بت بنا لیا گیا ہے۔ وہ اپنے انگریزی خطبات میں لکھتے ہیں:

"But with all their comprehensiveness, these systems are after all individual interpretations, and as such cannot claim finality. I know the Ulama of Islam claim finality for popular schools of Muhammadan Law, though they never found it possible to deny the theoretical possibility of complete ijtihad" (page 168).

"فقہی مذاہب اپنی جامعیت کے باوجود، بہرحال انفرادی تعبیرات ہیں اور حرفِ آخر ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ مجھے معلوم ہے کہ علماء فقہی مذاہب کے حرفِ آخر ہونے کے دعویدار رہے، اگرچہ ان سے کبھی ممکن نہیں ہوا کہ وہ اجتہادِ مطلق کا انکار کر سکیں۔"

علامہ اقبال اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کے افسانے پر بحث کرتے ہوئے، کہ ذہنی تساہل اور روحانی انحطاط کی وجہ سے بڑے مجتہدین کو بت بنا لیا گیا ہے، لکھتے ہیں:

"And partly by that intelectual Laziness, which especially in the period of spirtual decay, turns great thinkers into idols" (page. 178).

"اور یہ بھی کہ ذہنی تساہل کی وجہ سے، بالخصوص روحانی انحطاط کے زمانے میں، ائمہ مجتہدین کو بت بنا لیا جاتا ہے"۔

علم الکلام

علامہ اقبال نے بتانِ عجم میں چوتھا بت علمِ کلام کو شمار کیا ہے۔ وہ قوالی اور علمِ کلام' دونوں کو برابر کی موثر افیون قرار دیتے ہیں۔ لکھتے ہیں:

طبعِ مشرق کے لیے موزوں یہی افیون تھی
ورنہ قوالی سے کچھ کمتر نہیں علم الکلام[۶۱]

علم کلام، نظری مسائل کا مجموعہ ہے۔ خطیب، نظری مسائل کی لذت سے خوب محظوظ ہوتا ہے مگر وہ نہیں جانتا کہ اس کے منفی اثرات سے جماعت کا حشر کیا ہو گا۔ ملت کا شیرازہ ٹوٹ جاتا ہے۔ قوم فرد فرد ہو جاتی ہے اور اس کی قوموں میں کوئی وقعت باقی نہیں رہتی۔

میں جانتا ہوں جماعت کا حشر کیا ہو گا
مسائلِ نظری میں کھو گیا ہے خطیب[۶۲]

دینِ اسلام، مردانِ خود آگاہ اور خدامست کا دین ہے۔ وہ سراسر حرکت وحرارت اور سعیٔ پیہم ہے۔ جبکہ مذہبِ مُلّا جمود و تعطل اور تقلید اور رجعت کا نام ہے۔ یہ انسان کو جمادات اور نباتات کی طرح جامد اور ساکت بنا دیتا ہے:

وہ مذہبِ مردانِ خود آگاہ و خدامست:
یہ مذہبِ مُلّا و جمادات و نباتات[۶۳]

دینِ اسلام، ابدی حقیقت اور دائمی صداقت ہے۔ اس میں فرضی اور نظری بحث و تکرار کی گنجائش نہیں اور نہ یہ قال و اقوال کے جدل سے آشنا ہے مگر صد حیف! کہ حضرتِ مُلّا نے اسے حقائق سے دور کر دیا ہے اور لایعنی بحث و تکرار کی دلدل بنا دیا ہے۔ علامہ اقبال نے اس صورتِ حال کو اس طرح پیش کیا ہے:

میں بھی حاضر تھا وہاں ضبطِ سخن کر نہ سکا
حق سے جب حضرتِ مُلّا کو ملا حکمِ بہشت
عرض کی میں نے الٰہی مری تقصیر معاف
خوش نہ آئیں گے اسے حور و شراب و لبِ کشت
نہیں فردوس مقامِ جدل و قال و اقول
بحث و تکرار اس اللہ کے بندے کی سرشت [۶۴]

مُلّا و ملوک نے اسلام جیسے متحرک دین کو عجمی سانچے میں ڈھال کر اسے ہندی، ایرانی اور یونانی جامد اور ساکت عجمی بتوں کی شکل دے لی۔ ان کے نام اسلامی رکھ لیے اور خود اس کے پجاری بن گئے۔ جس طرح عجمی مذاہب کے پجاریوں نے مذہب کو تجارت بنالیا اور اسے اپنی اپنی دوکانوں پر سجالیا۔ اسی طرح ان کی پیروی میں صوفی و مُلّا نے بھی مذہب کے نام کی دوکانیں کھول لیں اور مذہب کی تجارت کا کاروبار شروع کر دیا۔ علامہ کہتے ہیں:

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن، تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن، تم ہو
بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن، تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن، تم ہو
ہو نکو نام جو قبروں کی تجارت کر کے!
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے؟ [۶۵]

یہی شیخِ حرم ہے جو چرا کر بیچ کھاتا ہے
گلیمِ بوذرؓ و دلقِ اویسؓ و چادرِ زہراؓ [۶۶]

نظری مسائل میں توحید خالص کو الجھا کر شیخ نے وہی کام کیا ہے جو برہمن صنم تراش کا کام ہے۔ اس لیے اگر پتھر کے بتوں کے پیکر نظر نہیں آتے تو عقاید تو بت پرستوں کے اپنا لیے گئے ہیں۔ علامہ کہتے ہیں:

پیکر اگر نظر سے نہ ہو آشنا تو کیا
ہے شیخ بھی مثالِ برہمن صنم تراش [۶۷]

بتانِ عجم کی پوجا کے اثرات

علامہ اقبال نے تمدن، تصوف، شریعت اور کلام پر جو مجتہدانہ بحث کی ہے، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اگرچہ ان کے ساتھ اسلامی کا لفظ لکھا جاتا ہے مگر درحقیقت ان کا اسلام سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ غیر اسلامی اور عجمی افکار، تعلیمات، نظریات اور تصورات کا مجموعہ ہیں جن پر اسلام کا لیبل لگا دیا گیا ہے۔ علامہ نے بڑے مضبوط اور قوی دلائل سے ان کے عجمی الاصل ہونے کو ثابت کیا ہے اور انہیں بتانِ عجم قرار دیا ہے۔ انھوں نے ان کا تاریخی پس منظر بیان کر کے صاف طور پر بتایا کہ موروثی ملوکیت اور مذہبی پیشوائیت نے باہمی مفادات کی خاطر انہیں تراشا تھا۔ ملوکیت نے اپنے سیاسی ظلم و استبداد سے اور ملائیت نے مذہبی قوت و قہر سے مسلمانوں کو ان بتوں کی پوجا پر مجبور کیا ہے۔ جس سے مسلمان کے عشق کی آگ بجھ گئی ہے اور وہ محض راکھ کا ڈھیر بن کے رہ گئے ہیں۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

بجھی عشق کی آگ، اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے[۶۸]

ملوکیت، ملائیت، خانقاہیت اور رہبانیت نے مسلمان کو "بتانِ عجم" کی پوجا پر لگا کر اس کے ذہن اور ضمیر کو پوری طرح کچل ڈالا، حتیٰ کہ خود صوفی و ملا مکیوں کی فہرست میں شامل ہو کر ملوکیت کی غلامی اور بندگی اختیار کرنے پر مجبور ہو گئے:

یہ ہماری سعیِ پیہم کی کرامت ہے کہ آج!
صوفی و مُلّا ملوکیت کے ہیں بندے تمام[۶۹]

مسلمان کا قلب و ضمیر نورِ مصطفیٰؐ سے منور ہو کر پوری دنیا کو روشن کر گیا تھا مگر جب اس کے آئینۂ قلب و ضمیر پر ملوکیت و ملائیت اثر انداز ہوئی تو اس کی آئینہ ضمیری باقی نہ رہی۔ سلطانی و ملائی و پیری کے اقانیم ثلاثہ نے توحید، رسالت اور آخرت کے صاف و سادہ عقاید کی جگہ اپنی الوہیت اور ظل الٰہیت کی تاریکی پھیلا دی۔ نتیجۃً مسلمان سلطانی و ملائی و پیری کا کشتہ بن کے رہ گیا۔ وہ ایک طرف صیدِ ملّایاں بن گیا تو دوسری طرف نخچیرِ ملوک کی حیثیت اختیار کر گیا:

باقی نہ رہی تیری وہ آئینۂ ضمیری
اے کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری[۷۰]

صیدِ مُلّایان و نخچیرِ ملوک
آہوئے اندیشہ او لنگ و لوک[۱۱]

علامہ اقبال مسلمان کو ان بتانِ عجم کی پوجا سے نجات دینا چاہتے ہیں۔ اس "کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری" کی زنجیریں توڑ کر "صیدِ ملّایان و نخچیرِ ملوک" کا پنجرہ کھول کر اسے ہمت و حوصلہ دیتے ہیں کہ وہ پھر سے شاہبازی کا ہُنر سیکھے۔ وہ اس شاہین بچے کو نئے بال و پر دیتے ہیں تاکہ وہ اس قیدِ غلامی سے آزادی حاصل کر کے پھر صاف اور بلند فضائے بسیط میں محوِ پرواز ہو۔ وہ ان ممولوں کو شہبازوں سے پنجہ آزمائی کی ہمت دیتے ہیں:

اٹھا ساقیا پردہ اس راز سے
لڑا دے ممولے کو شہباز سے[۱۲]

اسلام میں چار مطاع ہیں:

۱۔ اللہ
۲۔ رسولؐ
۳۔ قرآن اور
۴۔ سنّت

سلطانی و ملّائی و پیری نے اپنی خدائی منوانے کے لیے اسلام کے مقرر کردہ مطاع بدل کر ان کی جگہ چار نئے مطاع تراشے:

۱۔ تمدّن
۲۔ تصوّف
۳۔ شریعت اور
۴۔ کلام

علامہ اقبال نے اپنی اجتہادی صلاحیت سے انہیں بت قرار دیا اور ان کی اطاعت کو بت پرستی کہا۔ انہوں نے مسلمان کو بیدار کیا کہ اصل مطاع کی طرف رجوع کرنے کے لیے ضروری ہے کہ عجمی بت خانے کے بتانِ عجم کو پہلے پاش پاش کیا جائے تاکہ اصل منبع و ماخذِ اسلام کی راہ اس سنگِ گراں سے صاف ہو۔

مغلیہ ملوکیت کے زوال و انحطاط کے بعد اس کے نظامِ تعلیم پر اب تک جتنی بحث و تحقیق ہوئی ہے اس پر علامہ اقبال کی یہ تنقید شدید ترین ہے۔ تین مسلمان ملوکیتیں بیک وقت قائم تھیں:

۱۔ مغربی ایشیا ۲۔ شمالی افریقہ اور مشرقی یورپ میں عثمانیہ

۳۔ وسطِ ایشیا میں صفویہ اور جنوب مشرقی ایشیا میں مغلیہ

ان تینوں ملوکیتوں کے نظامِ تعلیم کم و بیش یکساں تھے۔ علامہ اقبال کے تبصرہ و تنقید کے مطابق، اپنے دورِ زوال میں یہ تینوں ایک ہی طرح کی کیفیت سے دوچار تھے جو بالآخر ان کے انحطاط کا بنیادی سبب قرار پایا۔ علامہ اقبال کی بصیرت افروز بحث و تحقیق کے مندرجہ ذیل اسباب معلوم ہوتے ہیں:

اوّل: جس دقتِ نظر اور عمقِ فکر کے ساتھ علامہ اقبال نے اس نظامِ تعلیم کا مطالعہ و تجزیہ کیا ہے یہ کسی دوسرے کو نصیب نہیں ہوا۔

دوم: اس کے تجزیے و تحقیق کے لیے جس وسعتِ علمی، وسعتِ قلبی اور وسعتِ فکری کی ضرورت تھی وہ علامہ اقبال کے علاوہ کسی دوسرے کے حصے میں نہیں آئی۔

سوم: مغلیہ ملوکیت کے خاتمے، انگریزی استعمار کی آمد اور مسلمانوں کی غلامی اور پستی کے اسباب و محرکات پر جتنی گہری نظر علامہ اقبال کو عطا ہوئی وہ خصوصی خدائی عطیہ تھی جو ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی۔

چہارم: نئے زمانے کے جدید تعلیمی تقاضوں کا پورا فہم اور اس نظامِ تعلیم کے ان پر یہ نہ اترنے کی بے بسی جتنی علامہ اقبال پر منکشف تھی شاید اس کا اتنا انکشاف کسی اور کو نہ تھا۔

پنجم: اس نصابِ تعلیم اور جدید سائنسی، تکنیکی، طبعی اور معاشرتی علوم کے تقابل کی جتنی قابلیت اور اہلیت علامہ اقبال میں تھی وہ کم لوگوں کو نصیب ہوئی۔

ششم: علامہ اقبال جدید منطق و فلسفہ کے متخصص تھے۔ وہ اس نصابِ تعلیم کی بنیاد قدیم یونانی منطق و فلسفہ کی فرسودگی سے خوب آگاہ تھے۔

ہفتم: تفسیرِ قرآن، شرحِ حدیث اور فقہ کے گہرے مطالعے سے یہ حقیقت ان پر منکشف ہو چکی تھی کہ ان پر عرب ایمپیریلزم کے مجوسی عقاید اور عجمی تصورات کے گہرے اثرات ہیں، جن کے نیچے اسلام کی اصل صداقتیں دب کر رہ گئی ہیں۔

ہشتم: اس نظامِ تعلیم کے ذریعے مسلمان کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری بن کے رہ گئے ہیں اور ان کی حالت صیدِ ملایان و نخچیرِ ملوک کی ہو گئی ہے۔

نہم: یہ نظامِ تعلیم تمدن، تصوف، شریعت اور کلام کے بتانِ عجم پر قائم تھا۔ اسے

چلانے والے اس کے پجاری بن کر رہ گئے تھے۔ یہ امتِ مسلمہ کے مفادِ مطلق اور مصلحتِ عامہ کے خلاف تھا۔

دوم: اس نظامِ تعلیم کو حکمتِ قرآن و دین اور دورِ جدید کے تقاضوں سے ہم آہنگ کرنے کے لیے جس دینی بصیرت، علمی قابلیت اور فکری صلاحیت کی ضرورت تھی، وہ خداوندانِ مکتب میں مفقود تھی۔

تعلیم کی تشکیلِ جدید

تعمیرِ نو کے لیے تعمیرِ اوّل کا مطالعہ سمیٹنا ضروری ہوتا ہے۔ مباحثِ بالا سے واضح ہوتا ہے کہ تاریخِ اسلام میں نظامِ حکومت اور نظامِ تعلیم دو دو دفعہ تعمیر ہوئے۔ پہلی تعمیر عہدِ رسالت و خلافتِ راشدہ میں ہوئی۔ یہ تعمیر اللہ، رسولؐ، قرآن اور سنّت کے اصولوں کے ستونوں پر قائم ہوئی جو چالیس برس تک قائم رہی۔ دوسری تعمیر عہدِ ملوکیت میں ہوئی۔ ملوک نے اپنی تعمیر کے لیے رسالت و خلافت کے اصولوں پر قائم عمارت کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ یہ تعمیرِ نو اللہ، رسولؐ اور قرآن و سنّت کی حکمرانی کی بجائے سلطانی و ملائی و پیری کی فرمانروائی کے لیے ہوئی۔ تعمیرِ اوّل قرآن و سنّت کے اصولوں پر قائم ہوئی تھی۔ تعمیرِ ثانی تمدن، تصوف، شریعت، کلام کے اصولوں پر قائم ہوئی۔ سلطانی و ملائی و پیری کا اسلام میں کوئی تصور نہ تھا۔ یہ سب عجمی تصورات تھے۔ ان عجمی اقانیم ثلاثہ کے جواز اور تائید کے لیے جن تمدنی، فقہی اور کلامی دلائل کی ضرورت تھی، ان کا اسلام میں وجود نہ تھا۔ اسلام کے نزدیک یہ بت تھے اور وہ خود بت شکن تھا۔ لہٰذا ان کی تائید انہیں عجمی ذرائع علم سے ممکن تھی، جہاں ان کی پرستش ہوتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ دلائل دانشِ عجم سے کشید کیے گئے۔ امتِ مسلمہ میں رواج پانے کے لیے دانشِ عجم کا اسلامی اسلوب میں ڈھلنا موزِ مملکت کا تقاضا تھا۔ اس مقصد کے لیے قرآن و سنّت کی تعبیر اس انداز سے ہوئی کہ عجمی تصورات و نظریات قرآن کی تفسیروں اور حدیث کی شرحوں میں جگہ پاگئے۔ گویا عجمی تصورات کی تائید قرآن و حدیث سے تلاش کرلی گئی۔ اب آیت قرآن کی پڑھی جاتی مگر اس کی تاویل عجم سے کی جاتی۔ اس طرح قرآن کے متن پر پازند کی تاویل چڑھادی گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن اور پازند برابر ہوگئے۔ مسلمان قرآن پڑھتا مگر اسے پازند سمجھتا۔ اسی کا نام مہجوریِ قرآن، ترکِ قرآن ہے۔ قیامت کے روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم شکایت کریں گے کہ:

"اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا"۔

وقال الرسول یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً : القرآن ۲۵-۳۰

مفسرِ قرآن علامہ اقبال نے اس آیت کی تفسیر اس شعر میں کی ہے :

خوار از مہجوریِ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

ترکِ قرآن کا یہی مطلب ہے کہ قرآن کے اصل معنی و مطلب کو سمجھنے اور اس پر عمل کرنے کو ترک کر دیا جائے اور اس کی جگہ عجمی اور بازندی تاویلات کو قرآن سمجھ کر ان پر عمل کیا جائے۔ مہجوریِ قرآن کی یہ بدترین شکل ہے اور اس میں سلطانی و ملائی و پیری کی کامیابی ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ نکلا کہ پہلے ملوکیت قائم ہوئی۔ اس نے اپنی تائید کے لیے ملائیت اور پیشوائیت پیدا کی۔ پھر ان تینوں نے اپنی تائید کے لیے تمدن، تصوف، شریعت اور کلام کے بتانِ عجم تراشے جو تیرہ سو سال قائم رہے۔ بالآخر مصطفیٰ کمال اتاترک نے ۱۹۲۴ء میں ان پر پہلی ضرب لگائی۔ عثمانیہ ملوکیت میں سلطانی و ملائی و پیری اگر ترکوں کو اجتہاد سے نہ روکتی تو یقیناً "جدید ترکی" "الحاد" کی بجائے جدید اجتہاد کا بانی ہوتا۔ کیونکہ ۱۷۱۸ء تا ۱۹۱۸ء دو سو سال تک اجتہاد اور تقلید میں کشمکش جاری تھی۔ اگر ترک مقلدین اور ترک مجتہدین کی مزاحمت کرنے کی بجائے ان سے تعاون کرتے تو ترکی نئے اجتہاد کا موجد ہوتا اور وہاں ہرگز سیکولرازم نہ آتا۔

علامہ اقبال نے اپنے اجتہاد سے اس صورتِ حال کو جانچا، پرکھا اور جانا پہچانا اور مجتہدِ مطلق کے عزم اور ہمت سے انہیں "بتانِ عجم" قرار دیا۔ وہ ان بتانِ عجم کو پاش پاش کر کے تعمیرِ نو کے داعی ہیں۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے ایک جدید اسلامی ریاست کے قیام کے لیے اجتہاد کیا جسے کروڑوں مسلمانوں نے قبول کیا۔ ان کے اجتہاد کی بنیاد پر ۱۹۴۷ء میں پاکستان معرضِ وجود میں آیا۔ قیامِ پاکستان کے بعد مسلمان کا قومی اور دینی فریضہ یہ تھا کہ علامہ اقبال نے اپنے اجتہاد سے اسلام کی جن اصل صداقتوں کو منکشف کیا تھا ان کی رہنمائی میں تعمیرِ نو کا مشن پورا کیا جاتا۔

علامہ اقبال کے تعلیمی نظریات

پاکستان ابتدا ہی سے تضادات کا شکار رہا ہے۔ عوام کو جب بھی موقع ملتا ہے وہ اپنے عقیدے، ذہن و ضمیر کے مطابق اتفاقِ رائے سے آئین بناتے ہیں اور خواہش کرتے ہیں کہ اس کے مطابق نظامِ حکومت و نظامِ تعلیم قائم ہو۔ دوسری طرف اس ملک میں عملاً زمانۂ ملوکیت کے اقانیمِ ثلاثہ "سلطانی و ملائی و پیری" کی حکمرانی بدستور قائم ہے۔ البتہ عہدِ حاضر میں "سلطانی"، جاگیرداری، سرمایہ داری اور فوجی و سول نوکر شاہی کے اقانیمِ ثلاثہ کی شکل اختیار کر گئی ہے۔ اس کے باوجود تعلیم کی تشکیلِ جدید پہ علامہ اقبال کے افکار و اجتہادات کا مطالعہ

ضروری ہے تاکہ جب کبھی عوام کو ان کا اختیارِ حکمرانی اور دستوری و قانونی حقوق حاصل ہوئے اور انہیں اپنے محسن علامہ اقبال کی تعلیمات کے مطابق نظامِ حکومت اور نظامِ تعلیم قائم کرنے کا موقع ملا تو وہ ان سے استفادہ کر سکیں۔

علامہ اقبال نظامِ تعلیم کی بنیاد دو اساسی اصولوں پر استوار کرتے ہیں:

ایک قرآن؛

دوسرے عقیدۂ ختمِ نبوت؛

ان کے نزدیک اسلامی حکومت، معاشرت اور تعلیم کا مرکزی اور محوری نقطہ قرآن ہے۔ وہ پورا اسلامی نظام اس مرکزی نقطے پر استوار کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن[۴۳]

وہ مسلمان کو مخاطب کر کے کہتے ہیں کہ اگر تو مسلمان بن کے زندہ رہنا چاہتا ہے تو یہ اس کے بغیر ممکن نہیں کہ تو قرآن کے مطابق زندگی گزارے۔ قرآن زندہ کتاب ہے۔ اس کی حکمت قدیم و لایزال ہے:

آن کتابِ زندہ، قرآنِ حکیم
حکمتِ او لایزال است و قدیم[۴۴]

قرآن کو حکومت، معاشرت اور تعلیم کی اساس بنانے سے ترقی و عروج حاصل ہوتا ہے اور اسے چھوڑ دینے سے ذلت و رسوائی کا سامنا کرنا پڑتا ہے:

خوار از مہجوریِ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر

قرآن مسلمان کو جو قوت عطا کرتا ہے وہ مادی وسائل پر حاوی ہوتی ہے۔ فقرِ قرآن سے جو طاقت حاصل ہوتی ہے دراصل وہی شاہنشاہی ہے:

جز بقرآں ضیغمی روباہی است!
فقرِ قرآں اصل شاہنشاہی است[۴۵]

قرآنی تعلیم ذکر و فکر میں توازن پیدا کرتی ہے۔ اس کے بغیر زندگی افراط و تفریط کا شکار ہو جاتی ہے:

نقشِ قرآں اختلاطِ ذکر و فکر
فکر را کامل ندیدیم جز بذکر[۵۶]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ اقبال کو قرآن کے ساتھ کتنا ایمانی اور جذباتی لگاؤ تھا۔ ان کے نزدیک اسلامی ریاست کی شناخت اور مسلمان کی پہچان ہی قرآن سے ہے!

قرآن مسلمان کی حیاتِ انفرادی اور اجتماعی کا ضامن اور محافظ ہے۔ وہ اس کے عقیدے اور عمل کی بنیاد ہے۔ قرآن کو نظامِ تعلیم کی بنیاد اسی شعور اور احساس کے ساتھ بنایا جانا ضروری ہے جس شعور کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انقلاب لانے کی غرض سے عرب قوم کے سامنے پیش کیا تھا۔ اگر قرآن کو پڑھنے اور پڑھانے کا وہی مقصد عربوں کے سامنے ہوتا جو آج کے مسلمان کے سامنے ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کبھی یہ مطالبہ نہ کرتے تو اس قرآن کے علاوہ کوئی قرآن لائیں یا اسے بدل دیں:

واذا تتلی علیھم ایاتنا بینات قال الذین لا یرجون
لقاءنا ائت بقرآن غیر ھذا او بدلہ قل ما یکون لی
ان ابدلہ من تلقای نفسی ان اتبع الا ما یوحی الی
انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم؛

القرآن: یونس ۱۰تا۱۵

"اور جب ان کو ہماری آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو جن لوگوں کو ہم سے ملنے کی امید نہیں وہ کہتے ہیں کہ یا تو اس کے سوا کوئی اور قرآن بنا لاؤ یا اس کو بدل دو۔ کہہ دو کہ مجھے اختیار نہیں ہے کہ اسے اپنی طرف سے بدل دوں۔ میں تو اسی حکم کا تابع ہوں جو میری طرف آتا ہے۔ اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو مجھے بڑے سخت دن کے عذاب سے خوف آتا ہے۔"

درحقیقت قرآن جب انقلاب اور تبدیلی پیدا کرنے کے شعور کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے تو مخاطبین اور سامعین میں یہ کیفیت پیدا ہونا لازمی امر ہے کہ یا تو وہ اسے مانیں اور اس کی قوت اور طاقت سے دنیا میں انقلاب برپا کر دیں یا اس کا انکار کر دیں اور اس کے سوا کسی دوسرے قرآن کا مطالبہ کریں۔ یہ ممکن نہیں کہ اسے مانا بھی جائے اور انفرادی اور اجتماعی زندگی میں کوئی تبدیلی بھی پیدا نہ ہو۔

دورِ زوال کے مسلمان نے قرآن کو ماننے اور اس پر عمل نہ کرنے کی روش عجم سے سیکھی۔ ان کے اہلِ مذہبی

کتابوں سے متعلق یہ عقاید گھڑ لیے گئے تھے کہ ان پر ایمان کی برکت سے نجات ہو جائے گی۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی ان کے مطابق بنانے کی ضرورت نہیں۔ مسلمان نے بھی اس کو اپنا لیا ہے۔ علامہ اقبال کی دعوت یہ ہے کہ قرآن کو نظامِ تعلیم کی بنیاد اس شعور اور احساس کے ساتھ بنایا جائے کہ پوری زندگی میں تبدیلی واقع ہو جائے۔

ختمِ نبوت اور اجتہاد

علامہ اقبال پہلے مجتہد ہیں جنہوں نے ختمِ نبوت کو اجتہاد کی اساس قرار دیا ہے۔ نبوت ختم ہو گئی ہے اور اجتہاد شروع ہو گیا ہے۔ علامہ اقبال کی یہ رائے تاریخ مذاہبِ عالم میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ وہ اپنے انگریزی خطبات کے باب "مسلم ثقافت کی روح" کے صفحہ ۱۲۶ پر لکھتے ہیں:

Looking at the matter from this point of wiew, then, the Prophet of Islam seems to stand between the ancient and the modern world. In so far as the source of his revelation is concerned he belongs to the ancient world; in so far as the spirit of his revelation is concerned he belongs to the modern world. In him life discovers other sources of knowledge suitable to its new direction. The birth of Islam, as I hope to be able presently to prove to your satisfaction, is the birth of inductive intellect. In Islam prophecy reaches its perfection in discovering the need of its own abolition. This involves the keen perception that life cannot for ever be kept in leading strings; that inorder to achieve full self-conciousness man must finally be thrown back on his own resources. The abolition of reiesthood and hereditary kingship in Islam, the constant appeal to reason and experience in the Quran, and the emphsis that it lays on Nature and History as sources of human knowledge, are all different aspects of the same idea of finality.

"اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یوں نظر آئے گا جیسے پیغمبر اسلام (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی حیثیت دنیائے قدیم اور زمانہ جدید کے درمیان ایک واسطے کی ہے۔ اپنے سرچشمہ وحی کے اعتبار سے آپ کا تعلق دنیائے قدیم سے ہے لیکن اپنی وحی کی

روح کے اعتبار سے آپ کا تعلق زمانۂ جدید سے ہے۔ آپ کے وجود سے حیاتِ انسانی پر علم و حکمت کے وہ سرچشمے منکشف ہوئے جو اس کے آیندہ رخ کے عین مطابق تھے۔ اسلام کا ظہور جیسا کہ آگے چل کر خاطر خواہ طور پر ثابت کر دیا جائے گا استقرائی عقل کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت اپنے ختم کے انکشاف سے اپنے معراج کو پہنچتی ہے۔ اس سے یہ گہری بصیرت حاصل ہوتی ہے کہ حیاتِ انسانی کو ہمیشہ بچے کی طرح ڈوری کے ذریعے چلنا سیکھنے کی کیفیت میں نہیں رکھا جا سکتا۔ مکمل شعور کے حصول کے لیے انسان کو بالآخر اپنے انسانی وسائلِ علم پر انحصار کرنا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے مذہبی پیشوائیت اور موروثی ملوکیت کو ختم کر دیا ہے۔ قرآن میں بار بار عقل اور تجربے پر زور دیا گیا ہے۔ عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ کو انسانی ذرائع علم قرار دیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ تمام ذرائع علم ختمِ نبوت کے مختلف پہلو ہیں"۔

علامہ اقبال کے اس اجتہاد سے یہ نتائج اخذ ہوتے ہیں:

اوّل: پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قدیم اور زمانۂ جدید کے درمیان واسطہ ہیں۔ آپ کی وحی کا تعلق، سرچشمہ کے اعتبار سے زمانۂ قدیم سے ہے، جبکہ اس کی روح کا تعلق دورِ جدید سے ہے۔

دوم: ظہورِ اسلام، دراصل استقرائی عقل کے ظہور کا نام ہے۔

سوم: آپ کے ظہور سے علم و حکمت کے ایسے چشمے جاری ہوئے جو نئے دور کے تقاضوں کے عین مطابق ہیں۔

چہارم: نبوت اپنے ختم کے انکشاف سے اپنے عروج کو پہنچ گئی ہے۔

پنجم: حیاتِ انسانی بلوغت کو پہنچ کر آیندہ نبوت کی محتاج نہیں رہی بلکہ اپنے وسائلِ علمی سے خود انحصاری حاصل کر چکی ہے۔

ششم: ختمِ نبوت اعلانِ عام ہے۔ ختمِ مذہبی پیشوائیت اور ختمِ موروثی ملوکیت۔

ہفتم: ختمِ مذہبی پیشوائیت، ختمِ ملوکیت، عقلی و تجرباتی علوم پر زور، فطرت اور تاریخی ذرائع علم پر انحصار، عقیدۂ ختمِ نبوت کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ ختمِ نبوت پر ایمان، ان ذرائع علم پر ایمان کا تقاضا کرتا ہے۔

ہشتم: ختمِ مذہبی پیشوائیت اور ختمِ موروثی ملوکیت کا انکار، عقیدۂ ختمِ نبوت کا انکار ہے۔

نہم: عقل و تجرباتی علوم پر زور کا انکار اور فطرت اور تاریخ کے ذرائع علم پر انحصار کا انکار، عقیدہ ختمِ نبوت کا انکار ہے۔

علامہ اقبال کے اس اجتہاد سے واضح ہوتا ہے کہ عقیدہ ختمِ نبوت نے حیاتِ انسانی پر علم و حکمت کے وہ سرچشمے منکشف کیے جو اسے آئندہ نبوت سے بے نیاز کر دیں۔ اس نے استقرائی عقل کو جنم دیا جس سے انسان اپنے انسانی علمی وسائل پر انحصار کر کے علمی خود کفالت حاصل کر سکتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت اور موروثی ملوکیت، دونوں علم و عقل کے دشمن ہیں۔ ختمِ نبوت ان دونوں کے خاتمے کا اعلانِ عام ہے۔ قرآن نے عقل، تجربے، فطرت اور تاریخ کو قرآنی علوم قرار دیا ہے۔ اس سے قرآنی علوم میں بے انتہا وسعت پیدا ہو گئی ہے۔ علامہ اقبال کے اس اجتہاد سے عقل، تجربے، مشاہدے، فطرت اور تاریخ کے ذرائع بھی کا انکار قرآن کا انکار ہے۔ علامہ کے اس اجتہاد کے مطابق دینی نظامِ تعلیم وہ ہے جو ان ذرائع علم پر مبنی ہو۔ جن میں سائنسی و تکنیکی علوم خاص طور پر قرآنی ہیں۔ درسِ نظامی کی درس گاہوں میں قرآن اور قرآنی ذرائع علم داخلِ نصاب نہیں۔ اس کے برخلاف قدیم یونانی منطق و فلسفہ جسے خود یونان و یورپ مسترد کر چکے ہیں، ان میں وہ اب تک داخلِ نصاب ہیں۔ اس کے باوجود یہ ادارے دینی مدارس کہلاتے ہیں۔

علامہ اقبال ــــ بانیٔ قرآنی سائنسی علوم

علامہ اقبال سائنسی و تکنیکی علوم کے داعی اس آیت کی طرف توجہ دلاتے ہیں:

سنریھم اٰیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم ۴۱: ۵۳

"ہم عنقریب ان کو آفاق اور انفس میں اپنی نشانیاں دکھائیں گے"۔

اس پر علامہ کا استنباط یہ ہے:

"Indeed the Quran regards both 'Antus' (self) and 'Afaq' (world) as sources of knowledge!

The Reconstruction P.127

"قرآن نے آفاق و انفس دونوں کو علم کا ذریعہ ٹھہرایا ہے"۔

آیاتِ الٰہیہ کا ظہور محسوسات و مدرکات میں، خواہ ان کا تعلق خارج کی دنیا سے ہو یا داخل کی دنیا سے، ہر کہیں ہو رہا ہے۔ لہٰذا ہمیں چاہیے کہ اس کے ہر پہلو کی قدر و قیمت کا کماحقہٗ اندازہ کریں اور دیکھیں کہ اس سے حصولِ علم میں کہاں تک مدد مل سکتی ہے۔

اگر ہم نے ختم نبوت کو مان لیا تو گویا بقیدۃً یہ بھی مان لیا کہ اب کسی شخص کو اس دعوے کا حق نہیں پہنچتا کہ اس کے علم کا تعلق چونکہ مافوق الفطرت سرچشمے سے ہے لہٰذا ہم پر اس کی اطاعت لازم ہے۔

علامہ اقبال جدید اسلامی ریاست میں جس نظامِ تعلیم کے داعی ہیں اس کی ایک جھلک اس اقتباس میں ملاحظہ کیجیے:

But inner experience is only one source of human knowledge. According to the Quran there are two other sources of knowledge, Nature and History; and it is in tapping these sources of knowledge that the spirit of Islam is seen at its best. The Quran sees signs of the ultimate Reality in the 'sun' the 'moon' 'the lengthening out of shodows,' 'the alternation of day and night,' the variety of human colour and tongues, 'the alternation of the days of success and reverse among peoples' in fact in the whole of nature as revealed to the sense–perception of man. And the Muslim's duty is to reflect on these signs and not to pass by them 'as if he is deaf and blind,' for he 'who does not see these signs in this life will remain blind to the realities of the life to come'. This appeal to the concrete combined with the slow realization that, according to the teachings of the Quran, the universe is dynamic in its origin, finite and capable of increase, eventually brought Muslim thinkers into conflict with Greek thought which, in the beginning of their intellectual career, they had studied with so much enthusiasm. Not realizing that the spirit of the Quran was essentially anti–classical, and putting full confidence in Greek thinkers, their first impulse was to understand the Quran in the light of Greek philosophy. In wiew of the concrete spirit of the Quran, and the speculative nature of Greek philosphy which enjoyed theory and was neglectful of fact, this attempt was foredoomed to failure. And it is what follows their failure that brings out the real spirit of the culture of Islam and lays the foundation of modern culture in some of its most important aspects.

لیکن مشاہدات باطن صرف ایک ذریعہ ہیں علم انسانی کا۔ قرآن پاک کے نزدیک اس کے دو سرچشمے ہیں : ایک عالم فطرت، دوسرا عالم تاریخ۔ جن سے استفادہ کرنے میں عالم اسلام کی بہترین روح کا اظہار ہوا۔ قرآن پاک کے نزدیک یہ شمس وقمر، یہ سایوں کا امتداد، یہ اختلاف لیل ونہار، یہ رنگ اور زبان کا فرق اور یہ قوموں کی زندگی میں کامیابی اور ناکامی کے دنوں کی آمد وشد، حاصل کلام یہ کہ یہ سارا عالم فطرت جیسا کہ بذریعہ حواس ہمیں اس کا ادراک ہوتا ہے حقیقت مطلقہ کی آیات ہیں اور اس لیے ہر مسلمان کا فرض ہے کہ ان میں غور وفکر سے کام لے۔ یہ نہیں کہ بہروں اور اندھوں کی طرح ان سے اعراض کرے۔ کیونکہ جو کوئی اس زندگی میں اندھوں کی طرح ان آیات سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے وہ آگے چل کر بھی اندھا ہی رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ محسوس اور ملموس حقائق پر بار بار توجہ کی اس دعوت کے ساتھ ساتھ جس کی قرآن مجید نے تعلیم دی، جب مسلمان رفتہ رفتہ اس حقیقت کو پا گئے کہ کائنات میں روانی اور حرکت ہے وہ متناہی ہے اور اضافہ پذیر تو انجام کار یونانی فلسفہ کی مخالفت پر، جس کا اپنی حیات ذہنی کی ابتدا میں انہوں نے بڑے ذوق وشوق سے مطالعہ کیا تھا، اتر آئے۔ شروع شروع میں تو انہیں اس امر کا احساس نہیں ہوا کہ قرآن مجید کی روح فلسفہ یونان کے منافی ہے اور اس لیے حکمت یونان پر اعتقاد کرتے ہوئے انہوں نے قرآن پاک کا مطالعہ بھی فکر یونان ہی کی روشنی میں کیا لیکن قرآن مجید کا زور چونکہ محسوس اور ملموس حقائق پر ہے اور حکمت یونان کا حقائق کی بجائے نظریات پر، لہٰذا ظاہر ہے یہ کوششیں ایک نہ ایک دن ضرور ناکام رہتیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ اسی کوشش کی ناکامی تھی جس کے بعد اسلامی تہذیب وثقافت کی حقیقی روح برسر کار آئی، حتیٰ کہ تہذیب جدید کے بعض اہم پہلوؤں کو دیکھیے تو ان کا ظہور بھی اسی کا مرہون منت ہے۔"

علامہ اقبال کے یہ بنیادی تعلیمی نظریات ہیں۔ یہی اسلامی تعلیم وثقافت کی اساس ہیں۔ شمس وقمر، لیل ونہار، رنگ وزبان، اقوام کے عروج وزوال؛ یہ سب حقیقت مطلقہ کی آیات ہیں۔ ان پر غور وفکر، ان کے پیچھے کارفرما قانون کی دریافت اور ان اصولوں کے مطابق تعلیم وثقافت کی ترتیب اور نظام حکومت ومعاشرت کا قیام، دینی

فریضہ ہے۔ جو لوگ ایسا نہ کریں وہ بہرے اور اندھے ہیں۔ اللہ و رسولؐ کے دشمن اور دین و آخرت کے منکر ہیں:

ومن کان فی ھٰذہٖ اعمیٰ فھو فی الآخرۃ اعمیٰ و اضلّ سبیلاً ۱۷:۷۲

"جو کوئی اس زندگی میں اندھوں کی طرح ان آیات سے اپنی آنکھیں بند رکھتا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا"۔

اس آیت میں "و اضلّ سبیلاً" خصوصی توجہ چاہتا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ عالمِ فطرت اور عالمِ تاریخ سے اعراض بہت بڑی گمراہی ہے۔ گویا قرآن کے حکم کے مطابق فطرت اور تاریخ کا مطالعہ ہدایت ہے اور اس سے روگردانی ضلالت ہے۔ علامہ اقبال نے قرآن کے اس حکم کو نمایاں کر کے فکرِ اسلامی میں انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ان کے نزدیک ہدایت صرف قرآن کے فقہی احکام پر عمل کرنے کا نام نہیں بلکہ فطرت اور تاریخ کے قوانین کا مطالعہ کرنا اور ان کے اصولوں پر عمل کرنا بھی بعینہٖ ہدایت ہے۔ قرآن کے فقہی احکام اور فطرت اور تاریخ کے مطالعے کو برابر اور یکساں دینی اہمیت دینا اجتہادِ مطلق کا درجہ رکھتا ہے۔ اس سے قرآن کے سائنسی تکنیکی، معاشرتی اور طبعی علوم کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ علامہ اقبال کے سائنسی علوم کے بانی قرار پاتے ہیں۔ روایتی طور پر عبادات بجالانا، چار شادیاں کرنا، جب چاہے طلاق دینا، زناکار کو کوڑے لگانا اور سنگسار کرنا، چور کے ہاتھ کاٹنا وراثت، شہادت اور دیت میں عورت کو آدھا حصہ دینا، ہدایت ہے۔ اس کی خلاف ورزی گمراہی ہے۔

علامہ اقبال کے اجتہاد کے مطابق فطرت اور تاریخ کا مطالعہ کرنا اور ان سے استفادہ کرنا اسی طرح کی ہدایت ہے جس طرح عبادات و فقہی احکام پر عمل، ہدایت ہے۔ فطرت اور تاریخ سے روگردانی اسی طرح گمراہی اور ضلالت ہے جس طرح عبادات و فقہی احکام سے اعراض گمراہی ہے۔ علامہ اقبال کے ان افکار سے یہ رہنمائی حاصل ہوتی ہے کہ ہدایت کی جو تعریف روایتی طور پر کی جاتی رہی ہے وہ ناقص و ناتمام ہے۔ لہٰذا یہ تعبیر بھی غلط اور ناقص ہے۔ ان دلائل کی روشنی میں ایک جدید اسلامی ریاست، ہدایت کی اس مکمل اور جامع تعریف کے مطابق قائم ہونی چاہیے۔ اس میں "درسِ نظامی" اور "درسِ برطانوی" دونوں ناقص و ناتمام قرار پائیں گے۔ درسِ نظامی نے قرآن، فطرت اور تاریخ تینوں سے دور ہے۔ درسِ برطانوی، اپنے استعماری اور الحادی ماخذ کی جانشینی سے دستبرداری حاصل نہیں کر سکا۔ علامہ اقبال کے مجوزہ نصابِ تعلیم پر عمل کے نتیجے میں مسلمانوں کی حالت کشتۂ سلطانی و ملّائی و پیری کی نہ ہوگی۔ نہ وہ "صیدِ ملّایان و نخچیرِ ملوک" ہوں گے اور نہ ہی "بتانِ عجم" کی پرستش ہوگی۔ یہ ایسا نصابِ تعلیم ہوگا جس پر (Stamp of Arabian imperialism) عرب ملوکیت کی چھاپ نہ ہوگی اور نہ اس پر "Magin Crust" مجوسی چھلکا ہوگا۔ (خطبات ۱۴۲)۔ یہ ایک جدید

اسلامی ریاست کا نصابِ تعلیم ہوگا جس میں اللہ، رسولؐ اور قرآن کی فرمانروائی ہوگی۔ یہ ریاست قرآنی احکام کے ذریعے فرد، معاشرے، حکومت اور دنیا میں ایک متوازن، معتدل اور پُرامن معاشرہ قائم کرے گی۔ فطرت اور تاریخ کے مطالعے سے سائنسی، ٹیکنالوجی، طبعی اور معاشرتی علوم کی بنیاد پر ایک سائنسی، تکنیکی، ترقی یافتہ اور خوشحال امت وسط کی شکل اختیار کرے گی جو "شھداء علی الناس" انسانیت کے لیے دنیوی اور اخروی فلاح کے نمونے کی شاہد ہوگی۔

حواشی

۱۔ ارمغانِ حجاز : ۸۹۔ ۹۱/۹۷۱۔۹۷۲
۲۔ ایضاً ص ۸۹/۹۷۱
۳۔ بالِ جبریل ص ۶۰/۳۵۲
۴۔ ارمغانِ حجاز، فارسی ص ۹۰/۹۷۲
۵۔ ایضاً
۶۔ ارمغانِ حجاز، اردو ص ۴۴/۶۸۶
۷۔ ایضاً ص ۱۲/۶۵۴
۸۔ ارمغانِ حجاز، فارسی ص ۷۳/۹۵۵
۹۔ ایضاً ص ۷۳/۹۵۵
۱۰۔ ضربِ کلیم ص ۲۲/۴۸۴
۱۱۔ ایضاً
۱۲۔ ایضاً ص ۶۴/۳۵۶
۱۳۔ ایضاً ص ۸۱/۵۴۳
۱۴۔ ایضاً ص ۲۲/۴۸۴
۱۵۔ بالِ جبریل ص ۱۱۷۔۱۱۸/۴۰۹
۱۶۔ ضربِ کلیم ص ۷۷/۵۳۹
۱۷۔ ایضاً ص ۷۷/۵۳۹
۱۸۔ ایضاً
۱۹۔ پس چہ باید کرد اے اقوامِ شرق :
ص ۲۳/۸۱۹
۲۰۔ ایضاً : ص ۱۵/۸۱۱
۲۱۔ ایضاً : ص ۴۹/۸۴۵
۲۲۔ جاوید نامہ ص ۷۶/۶۶۴
۲۳۔ ایضاً ص ۷۴/۶۶۴
۲۴۔ ضربِ کلیم ص ۷۹/۵۴۱
۲۵۔ ایضاً ص ۸۲/۵۴۴
۲۶۔ ایضاً ص ۱۶/۴۷۸
۲۷۔ جاوید نامہ ص ۷۶/۶۶۴
۲۸۔ ایضاً ص ۲۰۱/۷۸۹
۲۹۔ بالِ جبریل ص ۳۳/۳۲۵
۳۰۔ ضربِ کلیم ص ۶۲/۵۲۴
۳۱۔ ارمغانِ حجاز اردو ۱۳/۶۵۵
۳۲۔ ایضاً ص ۱۴۔۱۵/۶۵۶
۳۳۔ بالِ جبریل ص ۷۸/۳۷۰
۳۴۔ بانگِ درا ص ۱۸۷/۱۸۷
۳۵۔ بالِ جبریل ص ۳۶/۳۲۸
۳۶۔ ارمغانِ حجاز اردو ۴۳/۶۸۵
۳۷۔ بالِ جبریل ص ۲۹/۳۲۱
۳۸۔ بانگِ درا ص ۹۹/۹۹
۳۹۔ ارمغانِ حجاز اردو ۷/۶۴۸
۴۰۔ بالِ جبریل ص ۷۹/۳۷۱
۴۱۔ ایضاً ص ۱۲۴/۴۱۶

۴۲۔ بالِ جبریل ص ۳۴۹/۵۷
۴۳۔ بانگِ درا ۲۴/۲۴
۴۴۔ ایضاً ۱۸۲/۱۸۲
۴۵۔

۴۶۔ بالِ جبریل ص ۴۱۶/۱۲۴
۴۷۔ بانگِ درا ۲۰۳/۲۰۲
۴۸۔ ارمغانِ حجاز۔ فارسی ۹۷۸/۹۶
۴۹۔ بالِ جبریل ۳۵۷/۶۵
۵۰۔ ایضاً
۵۱۔ ایضاً ۳۳۷/۴۵
۵۲۔ ایضاً ۳۶۷/۷۵
۵۳۔ ایضاً ۳۶۲/۷۰
۵۴۔
۵۵۔ خطبات ص ۱۵۶
۵۶۔ تشکیلِ جدید ۱۷۸
۵۷۔ بالِ جبریل ۳۶۲/۷۰
۵۸۔ ایضاً ۳۷۰/۷۸
۵۹۔
۶۰۔
۶۱۔ ارمغانِ حجاز۔ اردو ص ۶۴۸/۶
۶۲۔ بالِ جبریل ۳۷۱/۷۹
۶۳۔ ایضاً
۶۴۔ ایضاً ۴۰۹/۱۱۷

۶۵۔ بانگِ درا ص ۲۱۰/۲۰۱
۶۶۔ بالِ جبریل ۳۱۵/۲۳
۶۷۔ بانگِ درا ۲۴۶/۲۴۶
۶۸۔ بالِ جبریل ۴۱۶/۱۲۴
۶۹۔ ارمغانِ حجاز۔ اردو ۶۴۸/۶
۷۰۔ ایضاً ۶۷۰/۲۸
۷۱۔ جاوید نامہ ۷۸۰/۲۰۱
۷۲۔ بالِ جبریل ۴۱۵/۱۲۳
۷۳۔ اسرار و رموز ۱۲۳
۷۴۔ ایضاً ۱۲۱
۷۵۔ جاوید نامہ ۶۶۸/۸۰
۷۶۔ ایضاً
۷۷۔
۷۸۔
۷۹۔